
آزادی
خرّم علی شفیق

آزادی

(دُوسرا ایڈیشن)

تحریکِ پاکستان کی مختصر تاریخ

خرّم علی شفیق

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

ISBN: 978-627-7400-02-6

ناشر:

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

Millat College Building
Near Khana Pul, Service Road East
VIP Ghauri Town, Islamabad Expressway
Islamabad, Pakistan
Phone: +92512248915
Email: info@alhijrah.pk

پہلی بار پاکستان میں الہجرہ سکولز ٹرسٹ نے ۲۰۲۶ء میں طبع کروا کے شائع کی۔

انتساب

پروفیسر حسنین کاظمی کے نام

*

آزادہ رَو ہُوں اور مِرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

فہرس

پہلی بات

ایک لحاظ سے یہ اِس کتاب کا دُوسرا ایڈیشن ہے لیکن اِسے ایک نئی کتاب ہی سمجھا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ مواد تقریباً وہی ہے لیکن پوری کتاب از سرِ نو لکھی گئی ہے۔ پہلے ایڈیشن کی بہت کم عبارتیں اِس میں شامل کی گئی ہیں۔ یہ پڑھنے والوں کی فرمائش پر کِیا گیا ہے۔ اِس لیے اُمید ہے کہ یہ نئی کتاب آپ کو زیادہ پسند آئے گی۔

برصغیر پر برطانوی حکومت کے نوّے برس دُنیا کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن دَور تھے، جب برطانوی سلطنت اپنے عروج پر بھی پہنچی اور پھر اچانک ہی اِس طرح ختم بھی ہوئی کہ ساری دنیا کی صورتِ حال بدل گئی۔ اُنہی بدلتے ہوئے حالات کے دوران پاکستان نے بھی جنم لیا۔ یعنی، بقول جمیل الدین عالی:

اِتنے بڑے جیون ساگر میں
ساحل اُبھرا بیچ بھنور میں

یہ کتاب اُسی داستان کا خلاصہ ہے۔ لیکن یہ تاریخ کے ساتھ ساتھ ایک تشریح بھی ہے تاکہ ہم اُس لڑی کو پہچان سکے جو واقعات کو آپس میں جوڑتی ہے اور اُنہیں ایک مسلسل کہانی بنا دیتی ہے۔

البتہ یہ تشریح آل انڈیا مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے ہے، جو ۱۹۴۷ء تک برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمایندہ بن چکی تھی۔ چنانچہ دُوسرے فریق جو اپنی جگہ اہم بھی ہو سکتے

ہیں، جیسے برطانوی حکومت، کانگرس یا دُوسری طبقاتی آوازیں، اُنہیں صرف اُتنی جگہ دی جا سکی ہے جتنی کہ مسلم لیگ کی نظر سے کہانی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہو۔ اِسی طرح یہ کتاب سماجی یا معاشی پہلوؤں کی تفصیل میں بھی نہیں جاتی اور نہ ہی تاریخ کو اُن زاویوں سے دیکھتی ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد پیش کیے گئے ہیں۔ تقریباً دو سو صفحات کی ایک مختصر کتاب میں یہ ممکن بھی نہیں تھا۔

کتاب کا انداز سادہ اور کہانی نما رکھا گیا ہے (پچھلے ایڈیشن کے متعلق سب سے زیادہ شکایت یہی سننے میں آئی تھی کہ وہ طویل اقتباسات کا مجموعہ لگتا تھا جن کے درمیان کہانی جیسا ربط تلاش کرنے میں قاری کو خاصی مشکل آتی تھی)۔ چنانچہ اِس نئی کتاب میں ارادے، خیالات اور فیصلے ایک دوسرے سے جُڑ کر واقعات کا سلسلہ بناتے ہیں۔ اِسے ہم واقعات کا "الگورتھم" (algorithm) بھی کہہ سکتے ہیں۔ مناظر اور کردار سامنے آئیں گے، وقت آگے بڑھے گا اور آپ ایک مسلسل بہاؤ کے ساتھ نوّے برس کا سفر طے کریں گے۔

حالات اور واقعات کی جو تصویر یہاں سامنے آ رہی ہے، اگر آپ کو غیر مانوس اور اجنبی محسوس ہو تو وجہ اِس کے سِوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم نے تحریکِ آزادی کے متعلق اب تک جو کچھ سنا اور پڑھا ہے، وہ زیادہ تر دُوسروں کے نقطۂ نظر سے بیان کی ہوئی باتیں ہیں۔ اُن میں سے بہت سی باتیں تو سچ بھی نہیں ہیں۔ جس تنظیم نے پاکستان بنایا تھا وہ چونکہ قیامِ پاکستان کے چھ سات برس بعد ختم ہو گئی، اِس لیے اُس کا اپنا نقطۂ نگاہ بہت کم ہمارے سامنے آیا ہے۔

یہ درست ہے کہ بہت سے مصنفین نے "نظریۂ پاکستان" کے دفاع پر مبنی تاریخیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن اُنہوں نے وہ تاریخیں اپنے اپنے نقطۂ سے لکھی ہیں۔ اُن میں سے کوئی بھی کتاب اِس شرط کے ساتھ نہیں لکھی گئی ہے کہ وہی کہا جائے گا جو مسلم لیگ نے کہا تھا، اور اُس کے سوا کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اِس کتاب میں یہی شرط پوری کرنے کی کوشش کی

گئی ہے۔

بعض منچلے مصنفین یہ اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ مسلم لیگ میں مختلف قیادتیں، الگ الگ آراء اور بظاہر اختلافات موجود تھے، لہٰذا اُس کی جدوجہد کو ایک مربوط نقطۂ نظر کے طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اعتراض بالکل بے بنیاد ہے۔ ایک تنظیم کے طور پر مسلم لیگ بالکل اُسی طرح ایک "اجتماعی شخصیت" (corporate entity) تھی جس طرح دنیا کا کوئی بھی دوسرا ادارہ ہوتا ہے۔ ادارے میں شامل افراد کی مختلف آراء ہو سکتی ہیں لیکن بالآخر فیصلہ اُس اجتماعی ادارے کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ وہی فیصلے اور پالیسیاں اُس ادارے کی تاریخ کا حصہ بنتی ہیں، نہ کہ ہر فرد کی الگ الگ رائے!

مثال کے طور پر، برطانوی پارلیمنٹ میں بھی ہر زمانے میں مختلف اراکین کی اپنی اپنی آرا رہی ہیں، لیکن تاریخ میں اُس وقت کی پارلیمنٹ کے اجتماعی فیصلے یاد رکھے جاتے ہیں۔ اِسی طرح کانگرس، مسلم لیگ یا کسی اور جماعت نے جب بطور ادارہ کوئی مؤقف اختیار کیا تو وہی اُس جماعت کی تاریخ کہلائے گا، چاہے اندرونی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ اِسی اُصول پر یہ کتاب مسلم لیگ کو ایک مسلسل اور مربوط لڑی کے طور پر دیکھتی ہے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ یہ کتاب "اقبال سائنسز" کے ایک وسیع تر منصوبے کا حصہ ہے۔ اقبال سائنسز سے مراد سوشل سائنسز کو علامہ اقبال کے متعین کیے ہوئے اُصولوں کی روشنی میں دیکھنا ہے۔ اُس حوالے سے انسانیت کے "ماضی، حال اور مستقبل کی تاریخ" دو حصوں میں، سرگزشتِ آدم اور حضرتِ انسان کے عنوانات سے بیان کی جا رہی ہے۔ اِس کتاب میں قومی تاریخ کا ایک اہم حصہ بھی اسی تناظر میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اقبال کی دوٹوک رائے یہ تھی کہ پوری قوم کی ایک ہی سیاسی تنظیم ہو، "جس کی شاخیں تمام صوبوں اور ضلعوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔" لیکن عام سیاسی اور مذہبی جماعتوں

کے برعکس ”اُس کا اساسی دستور ایسا ہونا چاہیے کہ ہر قسم کے سیاسی مکتبِ فکر کو اُبھرنے کا موقع مل سکے، جو اپنے شعور اور طریقوں سے ملّت کی رہنمائی کر سکے۔“[1]

اِس کتاب میں ہم دیکھیں گے کہ ۱۸۵۸ء سے ۱۹۴۷ء کے عرصے میں برصغیر کے مسلمانوں نے کس طرح اِس اصول کو دریافت کر کے اپنے آپ کو اِس کے تحت منظم کیا:

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوّتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خدا داد

خرّم علی شفیق

۷/اپریل ۲۰۲۶ء

[1] دیکھیے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے تیسرے اجلاس کا خطبۂ صدارت جو اقبال نے مارچ ۱۹۳۲ء میں لاہور میں پیش کیا؛ Sherwani, *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*, pp.30-49

باب ۱

نفرت کا آغاز

ہیروڈوٹس نے، جسے عام طور پر دنیا کا پہلا مؤرخ تسلیم کیا جاتا ہے، اپنی کتاب کا آغاز کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ میری "تحقیقات ہیں، جن کا موضوع یہ ہے کہ ہماری قوم اور دوسروں کے درمیان نفرت کا آغاز کہاں سے ہوا۔ نیز ہم نے، اُنھوں نے اور دنیا کے دوسرے لوگوں نے کون سے بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں۔"

اِس کتاب کے آغاز پر بھی یہی الفاظ مناسب ہیں۔ البتہ اِس کا تعین کرنا ضروری ہو گا کہ "ہماری قوم" اور "دوسروں" سے کون مراد ہیں۔

جس طرح ہیروڈوٹس نے اپنے عہد کی دشمنیوں کو سلجھانے کے لیے قدیم یونانیوں اور اُن کے مدّمقابل قوموں کی تاریخ کا جائزہ لیا، اُسی طرح ہم بھی اپنے زمانے اور اپنے خطے کی اُس کہانی کو دیکھیں گے جو مسلمانوں اور اُن کے روبرو آنے والی قوموں کے اشتراک سے پیدا ہوئی۔ اِس کتاب میں یہ کہانی آل انڈیا مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ سے بیان کی جارہی ہے، اِس لیے یہاں "ہماری قوم" سے مراد برصغیر کے مسلمان ہوں گے کیونکہ مسلم لیگ اُنہی کی واحد نمایندہ قرار پائی تھی۔

ہیروڈوٹس کی یونانی قوم بھی متعدد شہری ریاستوں میں پھیلی ہوئی تھی جو اپنی اپنی جگہ آزاد اور خودمختار تھیں، اور برصغیر کی مسلمان قوم بھی آج تین خودمختار ریاستوں میں آباد ہے: پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت۔ لیکن جیسا کہ ہم اِس کتاب میں دیکھیں گے، اِن تینوں ریاستوں کی بنیاد رکھنے والی یہی قوم ہے۔ اِس لیے ہیروڈوٹس کے یونانیوں کی طرح

برصغیر کے مسلمان بھی الگ الگ ریاستوں کے وفادار شہری ہونے کے باوجود ایک قوم اور ایک تہذیب سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔

اپنی اِس جدوجہد کے دوران "ہماری قوم" نے جن "دُوسروں" کے ساتھ معاملات طے کیے، اُن میں انگریز اور ہندو دو نمایاں قوموں کے طور پر ہمارے سامنے موجود تھیں۔

اِس کتاب میں یہ بھی دیکھا جائے گا کہ "ہم نے، اُنہوں نے اور دنیا کے دوسرے لوگوں نے کون سے بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں"، لیکن ہم ان تمام باتوں کو بھی مسلم لیگ ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھیں گے کیونکہ کتاب اُسی نقطۂ نظر سے لکھی جا رہی ہے۔ اِس لیے یہ صرف بادشاہوں اور سیاستدانوں کی کہانی نہیں بلکہ عام لوگوں، اسکولوں اور گلیوں میں سنی جانے والی دھڑکنوں کی آواز بھی ہے کیونکہ مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے تہذیب اور سیاست ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں تھے۔

لیکن آیئے، سب سے پہلے اِس سوال کا جواب تلاش کریں کہ "ہماری قوم اور دوسروں کے درمیان نفرت کا آغاز کہاں سے ہُوا؟"

*

ہم میں سے اکثر نے کبھی نہ کبھی ضرور سنا ہے کہ ۱۸۶۷ء میں سرسید احمد خاں نے (جنہیں اُس وقت سر کا خطاب نہیں ملا تھا)، بنارس کے انگریز کمشنر سے کہا کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا اکٹھے مل کر کام کرنا محال ہے۔ یہ گفتگو مولانا الطاف حسین حالی نے حیاتِ جاوید میں درج کی تھی لیکن اِسے جس طرح دہرایا جاتا ہے، اُس میں کئی اہم باتیں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُس اقتباس میں حالی ہمیں یہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دشمنی ایک خاص چیز نے پیدا کی تھی۔

حالی نے اصل میں یہ لکھا تھا کہ انگریزوں کے قائم کیے ہوئے اسکولوں میں جو کتابیں

پڑھائی جاتی تھیں، اُن میں مسلمانوں کے دَورِ حکومت کے بارے میں خاص تعصب برتا گیا تھا اور ''مسلمانوں کی برائیاں اور ظالمانہ کاروائیاں دانستہ یا نادانستہ نہایت تفصیل کے ساتھ درج کی گئی تھیں۔'' اُن اسکولوں میں زیادہ تر ہندُو تعلیم حاصل کرتے تھے (مسلمانوں نے بہت مدّت تک انگریزی تعلیم سے گریز کی، جیسا کہ ہم دیکھیں گے)۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم یافتہ ہندوؤں میں مسلم دَورِ حکومت کے خلاف ایک قسم کا نفسیاتی ہیجان پیدا ہو گیا۔ اُس سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات ''دوستی اور اتحاد بلکہ یگانگت'' پر مبنی ہُوا کرتے تھے لیکن انگریزی تعلیم نے اُنہیں ختم کر دیا۔

دُوسری طرف چونکہ مسلمان اپنی حکومت کھو بیٹھے تھے، اِس لیے ''مسلمانوں کا وقار جو ہندوستان کی قوموں کے دل میں مدت سے چلا آتا تھا وہ باقی نہ رہا تھا اور نہ رہ سکتا تھا۔''

اِن دونوں باتوں کے یکجا ہونے سے صرف یہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ ''انگریزی تعلیم حاصل کرنے والا ہندُو'' اپنے نئے اقتدار کا، جو اُس نے مدت کے بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت کچھ چاؤ اور اُمنگیں بھری ہوئی تھیں، مغلوب پارٹی [یعنی مسلمانوں] پر امتحان کرے۔''

اِس لیے ۱۸۶۷ء میں بنارس کے ''بعض سربر آوردہ ہندوؤں'' نے انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ سرکاری عدالتوں میں اُردو زبان اور فارسی رسم الخط کے بجائے ہندی (''بھاشا زبان'') رائج کی جائے اور اُسے دیوناگری رسم الخط میں لکھا جائے۔

سر سید نے اِس مطالبے کو صرف ایک لسانی مسئلہ نہیں سمجھا بلکہ اُنہوں نے اِس میں وہ تمام پس منظر دیکھ لیا جو یہاں بیان ہُوا ہے۔ کیونکہ، جیسا کہ حالی لکھتے ہیں، اُردو اصل میں ''ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے، اور جس میں عربی و فارسی کے صرف کسی قدر اسماٗ اُس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہے۔'' لیکن اُسے بھی ''ہمارے ہموطن بھائیوں نے صرف اِس بنا پر مٹانا چاہا کہ اُس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے

عہد میں پڑی تھی۔"

یہ پس منظر بیان کرنے کے بعد حالی لکھتے ہیں، "سر سید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔"

اُس کے بعد حالی نے سر سید کا اپنا بیان درج کیا ہے، اور وہ ہے:

> اُنہی دنوں میں، جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اُس وقت بنارس کے کمشنر تھے، مَیں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر اُنہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے، اِس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔
>
> میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اِس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب سے جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا، وہ دیکھے گا۔
>
> اُنہوں نے کہا، اگر آپ کی یہ پیشن گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا، مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشن گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔[1]

خاص طور پر نوٹ کرنے کی ضرورت ہے کہ سر سید کہہ رہے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مخالفت اور عناد، "اُن لوگوں کے سبب سے جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں"، بڑھے گا۔ اُس وقت تک یہ تعلیم یافتہ لوگ ہندُو تھے۔ بعد میں مسلمانوں نے تعلیم حاصل کر کے

---

[1] حالی، حیاتِ جاوید جلد اول، ص194-193

اِس فساد میں اپنا حصہ جس طرح ڈالا، ہم وہ بھی دیکھیں گے۔

بہر حال یہ بات واضح ہے کہ سر سید اور حالی کے مطابق دشمنی کا بیج انگریزی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جانے والی تعلیم نے بویا۔ چنانچہ حالی نے حیاتِ جاوید ہی میں ایک اور جگہ لکھا ہے کہ تعلیم ساری دنیا میں تعصب کو کم کرتی ہے لیکن ہندوستان میں ''برخلاف تمام دنیا کے، مذہبی اور قومی تعصبات ترقئ تعلیم کے ساتھ روز بروز بڑھتے جاتے ہیں۔''[1]

یہ خیالات صرف سر سید اور حالی تک محدود نہ تھے۔ اُن کے مکتبِ فکر کے کسی بھی شخص نے جب کبھی ہندُو مسلم تعلقات کے بگڑنے کے متعلق بات کی، مغربی تعلیم ہی کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ مثلاً ۱۹۰۷ء میں ہندُو رہنما گوپال کرشن گوکھلے لکھنؤ آئے تو اُن کے اعزاز میں دی گئی ایک تقریب میں سر سید کے جانشین نواب محسنُ الملک نے کہا کہ ''پچھلے زمانے میں جب کہ مغربی تعلیم سے ہندوستان بیخبر اور اس دولت سے محروم تھا،'' ہندو اور مسلمان اِس طرح رہتے تھے کہ اُن کے درمیان مذہب کے سِوا کوئی ''مغائرت اور بیگانگی''معلوم نہ ہوتی تھی:

> ایک، دوسرے سے محبت اور دوستی رکھتا تھا۔ شادی اور غمی کی تقریبوں میں دونوں دوستانہ بلکہ برادرانہ شریک ہوتے تھے۔ نہ کچھ جھگڑا تھا، نہ قصّہ، نہ دشمنی تھی، نہ عداوت۔ یہ مبارک زمانہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور وہ دلربا تصویر باہمی اتحاد کی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

محسنُ الملک نے کہا کہ ''اُس وقت اتحاد کی ضرورت اور فوائد پر لیکچر نہ دیئے جاتے تھے، نہ وعظ کہے جاتے تھے۔ لیکن جب سے مغربی تعلیم ہندوستان میں پھیلی ہے روز بروز اختلاف

[1] حالی، حیاتِ جاوید جلد اول، ص313

بلکہ مخالفت پیدا ہوتی جاتی ہے اور دوستی کی جگہ باہمی نفرت بڑھتی جاتی ہے۔"[1]

اگلی جنریشن کے جن مسلمانوں نے سرسید اور اُن کے مکتبِ فکر کے زیرِ اثر تربیت پائی، اُن کے خیالات بھی یہی تھے۔ مثلاً اقبال نے ۱۹۰۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں جدید نظامِ تعلیم کے بارے میں کہا، "نہ ہی یہ سطحی نظام ہندوؤں کے قدرتی مزاج کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ اُن میں یہ بہت سے سیاسی آئیڈیلسٹ پیدا کرتا نظر آرہا ہے جن کا تاریخ کا غلط مطالعہ اُنہیں سیاسی نظام اور معاشرتی امن کی تمام حالتوں کو درہم برہم کرنے پر مجبور کررہا ہے۔"[2]

محسنُ الملک کے جو خیالات ابھی بیان کیے گئے، اُنہی کا خلاصہ اقبال کی ایک مشہور مزاحیہ نظم میں بھی دیکھا جاسکتا جو ۱۹۱۴ء میں اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کے اجلاس میں سنائی تھی اور اب بانگِ درا (۱۹۲۴ء) میں شامل ہے:

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اَٹکا ہے
واں کنٹر سب بلّوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اُردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھٹکا ہے[3]

بالکل اِسی طرح مولانا محمد علی جوہر نے لندن میں پہلی گول میز کانفرنس کے دوران اپنے تحریری بیان میں، جو اُنہوں نے اپنی وفات سے چند روز قبل یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو لکھوایا، ہندُو مسلم مسئلے کی یہی وجہ بیان کی کہ برصغیر کے غیر مسلموں میں ماضی کی مسلم حکومتوں کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہندوستان میں "شاید ہی کوئی کمیونٹی ہو جسے

---

[1] امین زبیری، تذکرۂ محسن، ص180

[2] Sherwani, *Speeches, Writings and Statements of Iqbal,* p.110

[3] اقبال، بانگِ درا، ص338۔ انجمن کے اجلاس کی تفصیلات خرّم علی شفیق، اقبال: درمیانی دَور، ص41-40

پرانے زمانے کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف کوئی نہ کوئی حقیقی یا فرضی شکایت نہ ہو۔"

جوہر نے دیسی ریاستوں کا ذکر بھی کیا یعنی ہندوستان کی وہ تقریباً پانچ سو ریاستیں جنہیں انگریزوں نے مقامی حکمرانوں کے پاس ہی رہنے دیا تھا۔ اُن میں سے جموں و کشمیر جیسی بعض ریاستوں کو چھوڑ کر باقی جگہوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بڑے اچھے تعلقات برقرار تھے، خواہ حکمراں کا تعلق دونوں میں سے کسی بھی مذہب سے ہو۔ جوہر نے اُس کی بڑی وجہ بھی یہی بتائی کہ وہاں تاریخ کا وہ نصاب نہیں پڑھایا جاتا جو انگریزی اسکولوں میں رائج ہے۔ جوہر کے الفاظ میں، "صرف دیسی ریاستوں میں، جہاں تاریخ پڑھائی نہیں جا رہی بلکہ جہاں حکمرانوں کی بدولت ابھی تک تاریخ تشکیل دی جا رہی ہے، ... مسلمانوں کو صحیح معنوں میں تحفظ ملتا ہے۔"[1]

*

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اُس وقت تک ہندوؤں میں بھی اِس خیال کے لوگ باقی تھے۔ مثلاً ۱۹۱۹ء میں اُردو کے مقبول رسالے مخزن میں شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے بارے میں ایک مضمون شائع ہُوا۔ اُس کے مصنف ایک ہندُو، پنڈت وتستہ پرشاد فدا، تھے جو لاہور کے دیال سنگھ ہائی سکول میں تھرڈ ماسٹر تھے۔ اُنہوں نے افسوس ظاہر کیا کہ اسکول کے امتحانوں میں "سادہ لوح طالب علم دو تین نمبروں کی خاطر" اورنگزیب جیسے نیک انسان کے خلاف وہ جھوٹے الزام تحریر کر دیتے ہیں جو نصاب میں درج ہیں۔

مضمون میں اورنگزیب کا دفاع جس انداز میں کیا گیا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف ایک ہندو ہونے کے باوجود اورنگزیب سے صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ عقیدت رکھتا ہے۔ مثلاً ایک دفعہ ایک امیر نے کہا تھا کہ شہنشاہ کو کام کے ساتھ ساتھ آرام پر بھی

---

[1] IRTC1, *Sub-Committee 3*, pp.161, 165

توجہ دینی چاہیے۔ مصنف نے اِس کا ذکر کرتے ہوئے اورنگزیب کا وہ جواب بھی درج کیا ہے جو تحریری خط کی صورت میں محفوظ ہے، اور وہ یہ ہے کہ ''اُس قادرِ مطلق نے مجھے دنیا میں اِس غرض سے نہیں بھیجا کہ مَیں محنت و مشقت کرکے صرف اپنی زندگی برقرار رکھوں۔ بلکہ اِس لیے کہ مَیں اوروں کے لیے جیوں۔''

اورنگزیب کا دفاع کرنے والے مسلمان مصنفین بھی بعض اوقات اِس بات پر تذبذب میں پڑ جاتے ہیں کہ اورنگزیب نے تخت نشینی کی جنگ میں اپنے بھائیوں کو قتل کروادیا تھا۔ لیکن اِس مصنف نے ایک ہندُو ہونے کے ناتے مسلمانوں کی توجہ اِس طرف دلائی کہ ہندُو اپنی تاریخ کے معاملے میں کس طرح ''ژرف نِگری'' سے، یعنی چیزوں کو باریکی سے دیکھ کر، اپنے مشاہیر کو صاف بچا لیتے ہیں:

> دیکھیے مسلمانوں کی نسبت ہندُو کتنے ژرف نِگر واقع ہُوئے ہیں۔ ارجُن نے بھی تو کورو کھشیتر کے میدان پر ایک سو چچیرے [چچازاد] بھائیوں کو پچھاڑا تھا۔ لیکن کیا مجال جو کوئی ہندُو اُس پر حرف گیری کر جائے۔ بلکہ سب کے سب یکزبان ہو کر کہتے ہیں کہ کرشن نے تو پہلے ہی سے کوروَں کو نشانۂ اَجل بنا رکھا تھا۔ صرف ارجُن کے سر پر ظفرمندی کا سہرا باندھنا مقصود تھا جو اُس کے ہاتھوں میں شمشیر دی گئی۔[1]

*

بہرحال اِس قسم کے خیالات رکھنے والے ہندوؤں کی تعداد کم ہوتی گئی۔

چنانچہ حالی اور سرسید کے جو بیانات یہاں پیش کیے گئے، اُن میں جہاں انگریزی تعلیم ''مخالفت اور عناد'' کی وجہ قرار پاتی ہے، وہیں اُس ''مخالفت اور عناد'' کا آغاز مسلمانوں کی

---

[1] دیکھیے پنڈت وتستہ پرشاد فدا، 'شہنشاہِ عالمگیر خلد آشیانی'، مخزن جون ۱۹۱۹ء، ص۱۶-۹

طرف سے نہیں بلکہ ہندُوؤں کے ایک طبقے کی طرف سے ہوتا نظر آتا ہے۔ ویسے بھی اگر یہ مان لیا جائے کہ دشمنی کے بیج انگریزی تعلیم میں تھے، تو دشمنی کا آغاز بھی اُسی طبقے کی طرف سے فرض کرنا پڑے گا جس نے وہ تعلیم پہلے حاصل کی۔

سرسید اور حالی کے علاوہ دوسرے مسلمان رہنماؤں کے بیانات سے بھی جو مثالیں یہاں پیش کی گئیں ہیں، اُن میں بھی یہی بات، کہیں واضح طور پر اور کہیں بین السطور، دیکھی جاسکتی ہے۔

اِسی ماحول کی جھلک اُس درد میں بھی ملتی ہے جو مولانا شبلی نعمانی کے اِن اشعار میں موجود ہے جہاں اُنہوں نے ہندُوؤں کو مخاطب کر کے کہا ہے:

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی اِن ممالک پر
مگر وہ حکمرانی جس کا سکّہ جان و دِل پر تھا
تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اِتنا
کہ عالمگیر ہندُو کُش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا[1]

عام طور پر سمجھ لیا جاتا ہے کہ سرسید اور اُن کے مکتبِ فکر نے مسلم قومیت کو مستحکم کرنے کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی فرق کو نمایاں کرنے کی پالیسی اپنائی۔ جیسا کہ اِس باب میں پیش کیے ہوئے شاہد سے ظاہر ہے، یہ مفروضہ درست نہیں ہے۔ اور بقیہ کتاب میں دیکھیں گے کہ سرسید نے اپنی تحریک بالکل مختلف اور مثبت بنیاد پر رکھی تھی۔

لیکن اُس سے پہلے ایک اور بات سمجھنا بھی ضروری ہے۔

*

چونکہ مغربی تعلیم ماضی کی مسلم حکومتوں کے خلاف تعصب پیدا کرتی تھی، اِس لیے جب

---

[1] شبلی، کلامِ شبلی، ص 39-38

کسی نہ کسی وجہ سے مسلمانوں نے بھی یہ تعلیم حاصل کرنا شروع کی تو اُن پر بھی اِس تعلیم نے ایک منفی اثر ڈالا۔

جس طرح ہندوؤں میں اِس تعلیم نے ماضی کی مسلم حکومتوں کے خلاف ایک ہیجانی رویہ پیدا کر دیا تھا اُسی طرح مسلمانوں میں بھی پیدا کیا۔ لیکن مسلمان چونکہ خود اُسی قوم سے تعلق رکھتے تھے جس کے خلاف یہ تعلیم نفرت پیدا کرتی تھی، اِس لیے وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئے۔ خاص طور پر وہ اپنی قوم کو تو بہت ہی حقیر سمجھنے لگے۔ اِسے ایک قسم کا قومی احساسِ کمتری کہا جا سکتا تھا۔

اقبال نے اِس نکتے کو شاید سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ واضح کیا اور اِس کے متعدد پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ ۱۹۰۹ء میں انجمن حمایتِ اسلام میں اپنے اُس لیکچر میں، جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، اُنہوں نے کہا کہ تعلیم یافتہ مسلمان "قومی مفادات کے صحیح تصور اور ملک کی دوسری ملتوں کے درمیان اپنی ملت کی موجودہ صورت حال کے درست اندازے" سے محروم ہے۔ اِس لیے:

> وہ کسی ایسے مقصد کی حمایت سے جو نمایاں طور پر قومی اہمیت کا حامل ہے، محض اِس لیے گریز کرتا ہے کہ اُس کی لاتعلقی کسی ایسے بارسوخ ہندو کی خوشنودی کا باعث ہو گی جس کے ذریعے اُسے کوئی ذاتی فائدہ پہنچنے کی امید ہے![1]

مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کے اِس مخصوص احساسِ کمتری کا تجزیہ کر کے اِس کے علاج تجویز کرنا اقبال کی علمی تحریروں اور اُن کی سیاسی جدوجہد کا ایک بنیادی موضوع ہے۔ اُن کی شاعری میں یہ موضوع علم اور عقل کے مقابلے پر عشق کی اہمیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اور خاصا مشہور ہے:

---

[1] Sherwani, *op. cit.,* p.107

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کُہن ہُوا
عشق تمام مصطفیٰؐ، عقل تمام بُولَہب[1]

۱۹۳۸ء میں اپنی وفات سے چند ہفتے قبل اپنے آخری مقالے ”اسلام اور وطنیت“ ("Islam and Nationalism") میں اقبال نے یہاں تک کہا کہ اب یہ ”مغرب زدگی“ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے علاوہ دینی رہنماؤں میں بھی عام ہو رہی ہے۔[2]

چنانچہ اقبال کی جنریشن میں سب سے زیادہ وہی لوگ اِس احساسِ کمتری سے بچے ہوئے دکھائی دیئے جن پر سرسید کے مکتبِ فکر کے براہِ راست یا بالواسطہ اثرات تھے۔ اقبال، علی برادران (مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی) اور قائداعظم وغیرہ ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

اِس قسم کے لوگوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کے عام تعلیم یافتہ طبقے کے بارے میں قائداعظم کی رائے بھی اقبال سے مختلف نہ تھی۔ مثلاً مئی ۱۹۴۵ء میں مرزا ابوالحسن اصفہانی کے نام خط میں وہ لکھتے ہیں:

> ہندوستان میں اور مسلمانوں میں بدعنوانی کی لعنت موجود ہے، خاص طور پر نام نہاد تعلیم یافتہ اور دانشور طبقے میں۔ بدقسمتی سے یہی طبقہ ہے جو خود غرض ہے، اور اخلاقی اور ذہنی طور پر دیوالیہ ہے۔ بیشک یہ مرض عام ہے لیکن مسلمانوں کے اِس مخصوص طبقے میں تو ہر طرح سے چھایا ہوا ہے۔[3]

محمد امین زبیری نے، جو اُس عہد کے ایک اہم ترین موٴرخ تھے، اپنی کتاب سیاستِ ملّیہ (۱۹۴۱ء) کے دیباچے میں لکھا ہے کہ چونکہ انگریزی دَور میں ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی

1

2 *Ibid.,* p.301

3 Saleena Karim, *Secular Jinnah & Pakistan,* p.175

خود اپنی تاریخ لکھنے پر زیادہ توجہ نہ دی، اِس لیے اُنہیں اسکول سے یونیورسٹی تک ہر سطح پر "اغیار کی لکھی ہوئی تاریخیں" پڑھنی پڑیں۔ اور "اُن تاریخوں میں جو زہر بھرا ہُوا ہے اور مسلمانوں کے جسم میں جس طرح سرایت کر رہا ہے، [اُس کا] ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان خود اپنی ہی نظر میں حقیر معلوم ہونے لگے۔"[1]

*

اگر ہم پچھلے حصے میں دیے گئے تمام شواہد کو اکٹھا کریں، تو ایک غیر متوقع نتیجہ سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ غریب عوام تعلیم یافتہ طبقے سے بہتر ہیں کیونکہ وہ اپنی قوم کے بارے میں اُس احساسِ کمتری سے پاک ہیں جس میں تعلیم یافتہ طبقہ مبتلا ہے۔

یہ بات تسلیم کرنا ہمارے لیے کافی مشکل ثابت ہو سکتا ہے اور شاید ہمارا ذہن اِس پر یقین بھی نہ کرے۔ لیکن ہم نے یہاں جن رہنماؤں کے حوالے دیئے ہیں، وہ سب اِس بات پر متفق تھے۔

اِس کے شواہد پوری کتاب میں قدم قدم پر آپ کے سامنے آتے رہیں گے کیونکہ یہ بات ایک طرح سے اُس تحریک کے بنیادی عقائد میں شامل تھی جس کی کہانی اِس کتاب کا موضوع ہے۔ یہاں صرف دو چار مثالیں نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

اقبال کے ۱۹۰۹ء کے جس لیکچر کا حوالہ پہلے دو دفعہ دیا جا چکا ہے، اُسی میں اُنہوں نے کہا تھا:

> میں کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہتا ہوں کہ ایک ناخواندہ دکاندار جو رزقِ حلال کماتا ہے اور بازوؤں میں اتنی قوت رکھتا ہے کہ مشکل وقت میں اپنے بیوی بچوں کی

[1] امین زبیری، سیاستِ ملیہ، ص 1

حفاظت کر سکے، میں اُس کی زیادہ عزت کرتا ہوں بہ نسبت اعلیٰ ثقافت رکھنے والے ذہین وفطین گریجویٹ کے، جس کی مدھم دبی ہوئی آواز جسم کے روح سے خالی ہونے کی غماز ہے۔[1]

یہ رجحان اقبال کی تقریباً ہر تحریر میں نمایاں ہے، کہیں واضح اور کہیں مدھم! یہاں تک کہ جب ۱۹۳۲ء میں جب قوم انتشار کی بدترین پستیوں کو چھُو رہی تھی تو اقبال نے اُس معاملے میں بھی عوام کو بالکل بے قصور قرار دیا۔ ''مسلمان عوام اِس ملک میں اپنی حتمی تقدیر کے معاملے میں ایثار کے جذبے سے پوری طرح معمور ہیں،'' اقبال نے کہا۔ ''قصور ہمارا ہے، اُن کا نہیں ہے۔''[2]

مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے جس اجلاس میں قراردادِ پاکستان منظور کی گئی، اُس میں قائداعظم نے بھی اپنے خطبۂ صدارت میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا، ''عوام پوری طرح بیدار ہیں۔ اُنہیں صرف آپ کی رہنمائی اور قیادت کی ضرورت ہے۔''[3] اور پاکستان کے قیام کا اعلان ہونے کے بعد کراچی پہنچنے کے بعد بھی، ۹ اگست ۱۹۴۷ء کو، اُنہوں نے کہا، ''میں نے یہ کام تنہا نہیں کیا ہے۔ میرے ساتھ لاکھوں تھے، خاص طور پر عوام! پڑھا لکھا طبقہ آخر میں آیا۔ عوام پہلے آئے۔''[4]

*

برطانوی تعلیم نے برصغیر کے ذہنوں میں جو تعصب پیدا کیا تھا، اُس کا پہلا نشانہ گزرے ہوئے مسلم حکمراں بنے۔ لیکن یہ بھی ایک تاریخی سچائی تھی کہ وہ اگر باہر سے آئے تھے، تو انگریز تو اُن سے بھی زیادہ غیر ملکی تھے۔ آہستہ آہستہ ہندوستان کے نوجوان ذہن

---

[1] Sherwani, *op. cit.,* p.107

[2] Sherwani, *op.cit.,* p.45-46

[3] Yusufi, *op. cit.,* p.1184

[4] Saleena Karim, *Secular Jinnah & Pakistan,* p.315

ہندوستان کے برطانوی دَور کی تاریخ کے ساتھ وہی سلوک کرنے لگے جو سلوک مسلم دَور کی تاریخ کے ساتھ کرنے کی تربیت اُن کی تعلیم نے اُنہیں دی تھی۔

۱۹۰۷ء کے لگ بھگ یہ سوچ برطانوی اقتدار کے خلاف ایک ایسے طوفان انگیز بیانیے میں ڈھلنا شروع ہو گئی جس میں سنجیدگی کم اور جوش زیادہ تھا۔ وہی جذباتیت زدہ بیانیہ اب ایک مدّت سے علمی دنیا میں سکّہ رائج الوقت بنا ہُوا ہے۔

اس کے برعکس، وہ رہنما جن کے اقوال ہم نے اس باب میں پیش کیے، ایک میانہ رو راستہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ اُن کے نزدیک تاریخ کوئی ایسی خلیج نہیں تھی جو قوموں کے درمیان ہمیشہ کے لیے حائل رہے۔

عظیم بنگالی رہنما چت رنجن داس نے ۱۹۱۷ء میں کہا کہ "ہر کامیابی کے ذریعے، ہر ناکامی کے ذریعے، ہر جنگ کے ذریعے جو جیتی گئی، ہر جنگ کے ذریعے جو ہاری گئی،" ہندوستان کی تاریخ اپنی تقدیر تراشتی آئی ہے۔[1]

۱۹۳۶ء میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کے دوران جناح نے یاد دلایا کہ ہم نے ایک دوسرے کو شکست بھی دی ہے اور ایک دوسرے سے شکست بھی کھائی ہے، لیکن اصل خوشی "دونوں بہادر قوموں کے درمیان ایک آبرومندانہ تصفیے" میں ہے۔[2]

یہی سوچ جناح نے ایک اور موقع پر یوں بیان کی:

> میں یہ بات کسی بدخواہی یا دل آزاری کے بغیر کہتا ہوں۔ بعض قومیں ایک دوسرے کے لاکھوں انسان قتل کر دیتی ہیں۔ لیکن یہ مستقل نہیں ہوتا۔ آج کا دشمن کل کا دوست ہے۔ یہی زندگی ہے۔ یہی تاریخ ہے۔[3]

---

1 Das, *India for Indian,* pp.67-68

2 Yusufi, *Speeches, Statements & Messages of the Quaid-e-Azam*, pp.204-205

3 24 April 1943; Yusufi (ed.), *op. cit.,* p.1711

یہی وہ زاویۂ نگاہ ہے جس کا مسلم لیگ اپنے لیے دعویٰ کرتی تھی۔ اِس لیے جب ہم برطانوی راج کے زمانے کی تاریخ مسلم لیگ کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک ایسی تصویر ملتی ہے جس میں ماضی کے زخموں سے زیادہ مستقبل کے امکانات نظر آتے ہیں۔

ہیروڈوٹس شاید یہ جان کر مطمئن ہو سکتا تھا کہ "ہماری قوم اور دوسروں کے درمیان نفرت کا آغاز کہاں سے ہُوا۔" لیکن قائداعظم کی رُوح مطمئن نہیں ہو سکتی جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ ہماری قوم اور دُوسروں کے درمیان دوستی کیسے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ "یہی زندگی ہے۔ یہی تاریخ ہے۔":

خردمندوں سے کیا پُوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ مَیں اس فکر میں رہتا ہوں، میری انتہا کیا ہے
نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اُس میں
نہ پُوچھ اے ہم نشیں مجھ سے وہ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے[1]

1

باب ۲

تمام انسانوں کی رُوح

۱۸۵۸ء سے ۱۸۸۶ء

''انگلستان کب تک ہندوستان پر حکومت کرے گا؟''

انگریز سیاستداں جان برائٹ نے اپنی پارلیمنٹ سے پوچھا۔ ۴/ جون ۱۸۵۸ء کو برطانوی پارلیمنٹ کے دارُالعوام (ہاؤس آف کامنز) میں اِس مسئلے پر بحث ہو رہی تھی کہ ہندوستان کے جو علاقے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت ہیں، اُنہیں کمپنی کے بجائے براہِ راست برطانیہ کے سپرد ہونا چاہیے۔

برائٹ نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا، ''کوئی اِس سوال کا جواب نہیں دیتا اور کوئی اِس کا جواب دے بھی نہیں سکتا۔'' لیکن برطانیہ خواہ ہندوستان پر پچاس برس حکومت کرے، خواہ پانچ سو برس حکومت کرے، وہ اُسے ایک ملک نہیں بنا سکے گا۔ ''مجھے یقین ہے کہ یہ بالکل ناممکن ہے،'' برائٹ نے کہا۔ ''اگر ہم نے کبھی یہ کوشش کی تو اِس میں ناکام رہیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ اِسی نقطے سے مستقبل پر نگاہ ڈالیں۔''

برائٹ کی تجویز یہ تھی کہ برصغیر کی خوشحالی کے لیے ضروری ہے کہ اُسے کسی ایک حکومت کے ماتحت کرنے کے بجائے چار پانچ ممالک میں تقسیم کر دیا جائے، جو اپنے اپنے مزاج کے مطابق ترقی کر سکیں۔[1]

---

[1] برائٹ نے یہ تقریر 4 جون 1858ء کو دارُالعوام میں کی۔ تحریکِ پاکستان کے دوران جناح نے کئی دفعہ حوالہ دیا اور

اکثریت نے اتفاق نہ کیا۔ پارلیمنٹ سے منظور ہونے والے آئین میں ہندوستان کو ایک ملک ہی تصوّر کیا گیا۔ البتہ انتظامی اعتبار سے وہاں دو طرح کی حکومتوں کی گنجائش رکھی گئی:

۱ برطانوی ہند یعنی برٹش اِنڈیا (British India) اُن علاقوں پر مشتمل تھا جن کا جن کا انتظام براہِ راست برطانیہ کے ہاتھ میں تھا۔ اِن کا بندوبست کرنے کے لیے "حکومتِ ہند" یعنی گورنمنٹ آف انڈیا بنائی گئی، جس سے مراد ہندوستان کی انگریزی حکومت ہوتی تھی۔ عام طور پر ہم جو تاریخ پڑھتے ہیں وہ صرف اِنہی علاقوں کی تاریخ ہوتی ہے، مثلاً تمام صوبے برطانوی ہند میں ہی شامل تھے، اور کانگرس مسلم لیگ کی سیاسی سرگرمیاں بھی کم سے کم ۱۹۳۰ء تک صرف اِنہی علاقوں میں تھیں۔ لیکن یہ علاقے برصغیر کا صرف دو تہائی یعنی تقریباً پینسٹھ فیصد تھے۔

۲ بقیہ ایک تہائی یعنی تقریباً پینتیس فیصد علاقہ نیم آزاد ریاستوں پر مشتمل تھا، جن کے حکمرانوں نے انگریزوں کے ساتھ براہِ راست معاہدے کر رکھے تھے۔ وہ سب برطانیہ کی اطاعت کرتے تھے لیکن اپنی اپنی ریاستوں پر خود حکومت کرتے تھے، جس کی شرائط ہر حکمراں کے لیے الگ تھیں۔ ان ریاستوں کی کُل تعداد ساڑھے پانچ سو کے قریب تھی، جن میں سے جموں و کشمیر اور حیدرآباد دکن جیسی ریاستیں دنیا کے بعض ممالک سے بھی بڑی تھیں، اور بعض ریاستیں کسی چھوٹی سی جاگیر کے برابر تھیں۔ اِن کے لیے "دیسی ریاستیں" (Native States) جیسی اصطلاحات وجود میں آرہی تھیں لیکن عوام زیادہ تر صرف "ریاستیں" کہہ دیتے تھے۔ عوامی زبان میں یہ "ریاستی

برائٹ کے موٗقف کی تائید کی؛ Yusufi, *op. cit.*, pp.1763-1764, 1794, 1813, 1839

ہندوستان" کہلاتا تھا۔

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہندوستان میں نیا آئین (The Government of India Act 1858) نافذ کیا گیا جس کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے بجائے یہ نظام رائج ہُوا۔ چند برس بعد پارلیمنٹ نے ملکہ وکٹوریہ کو "ایمپریس آف آنڈیا" (Empress of India) کا لقب دیا، جس کا ترجمہ "قیصرۂ ہند" کیا گیا۔ بعد میں ملکہ کے مَرد جانشین "قیصرِ ہند" (Emperor of India) کہلائے۔ انگریزی کی اصطلاح "ہر میجسٹی" (Her Majesty) کی جگہ اُردو میں "ملکہ معظمہ" کہہ دیا جاتا تھا۔ اِس لیے بعد میں جب ملکہ کی جگہ بادشاہ آئے، تو اُنہیں "مَلِکِ معظم" کہا گیا۔ یہ "ہز میجسٹی" (His Majesty) کا اُردو مترادف تھا۔ مثلاً برطانیہ کی حکومت کو ملکہ معظمہ کی حکومت (Her Majesty's Government) یا مَلِکِ ملک معظم کی حکومت (His Majesty's Government) کہا گیا۔

نئے آئین کے نفاذ کے ساتھ ہی ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے ایک فرمان بھی جاری کیا گیا۔ اُس میں دُوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ "کوئی شخص اپنی ذات، نسل، مذہب یا رنگ کی وجہ سے سرکاری عہدوں سے محروم نہ کیا جائے گا بشرطیکہ وہ اپنی تعلیمی قابلیت اور دیانت کے لحاظ سے اس کی اہلیت رکھتا ہو۔ حکومت کسی کے عقائد میں بھی دخل اندازی نہ کرے گی۔"[1]

ظاہر ہے کہ اِس نیک خواہش پر مکمل عملدرآمد نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہی کبھی ہُوا۔ لیکن اُس زمانے کے ہندوستانیوں کی عام رائے یہی تھی کہ اُن کے خطّے کی ہزاروں برس کی تاریخ میں شاید پہلی دفعہ کسی حکمراں نے اپنی حکومت کو اعلانیہ اور تحریری طور پر اِن باتوں کا پابند کیا ہے (اگرچہ غیر رسمی طور پر ماضی کے بعض بادشاہ بھی انصاف اور مذہبی

[1] ترجمہ، زبیری، سیاستِ ملیہ، ص16

رواداری کی روشن مثالیں ضرور قائم کر گئے تھے)۔

*

زمینی صورت حال کچھ مختلف تھی۔

۱۸۶۰ء میں ہندوستان کے بعض حصوں میں ایک خوفناک قحط پڑا۔ سر سیّد (جو اُس وقت صرف سیّد احمد خاں تھے)، اُن دنوں مرادآباد میں افسر تھے۔ اُنھوں نے سرکاری محتاج خانے کا بندوبست اِس شرط پر قبول کیا کہ قحط کی وجہ سے یتیم ہو کر آنے والے ہندو اور مسلمان بچے، مسلمانوں اور ہندوؤں ہی کے سپرد ہوں، اور مسیحی مشنریوں کے حوالے نہ کیے جائیں۔ اُس زمانے میں ایسے بچے عموماً مسیحی تبلیغی اداروں کو دے دیئے جاتے تھے، جہاں بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا عمدہ انتظام تھا لیکن اُنھیں مسیحی بنادیا جاتا تھا۔

سر سیّد نے خود بھی کچھ مسلمان یتیموں کو گود لیا، جنھیں سر سیّد کی بیگم اپنے بچوں کی طرح پالنے لگیں۔ دُوسری طرف مشنریوں نے انگریز کمشنر سے کہا کہ زیادہ تر مسلمان اور ہندو سرپرست، یتیم بچوں کو لونڈی اور غلام بنالیں گے۔ بدقسمتی سے یہ اندیشہ غلط بھی نہ تھا۔ کمشنر نے ایک کمیٹی بنائی جس میں ہندوستانی بھی شامل تھے، اور اُس کمیٹی کی اکثریت نے مشنریوں کی تائید کر دی۔

سر سیّد کے دل پر جو قیامت گزری اُس کا اندازہ ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ اِس سے پہلے کہ کوئی اُن یتیموں کو لینے آئے جنھیں سر سیّد نے گود لیا تھا، سر سیّد نے خود ہی اُنھیں واپس بھجوا دیا۔ بچے جانا نہیں چاہتے تھے اور بُری طرح رو رہے تھے۔ لیکن، جیسا کہ حالی نے لکھا ہے، ''سر سیّد کہتے تھے کہ اُس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ جب کبھی موقع ملے تمام ہندو مسلمانوں سے چندہ کر کے صدر مقام میں ایک بہت بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے جہاں ہندوستان کے لاوارث بچوں کی پرورش ہو اور اُن کو تعلیم دی جائے۔''

یہ کوئی وقتی جوش نہ تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اِس منصوبے پر غور کرتے رہے کہ کس طرح "ایک بہت بڑا ایتیم خانہ قائم کیا جائے" جہاں پورے ہندوستان سے ہر مذہب کے لاوارث بچوں کی پرورش ہو، اور اُن کو تعلیم دی جائے۔

آہستہ آہستہ وہ اِس نتیجے پر پہنچے کہ صرف یتیم خانہ بنانے سے مقصد حاصل نہ ہو گا۔ پورے ہندوستان کو ایک ایسا معاشرہ بنانا ہو گا جہاں کوئی محتاج نہ ہو، اور اِس کے لیے تعلیم ضروری ہے۔ "آخر کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہو گی اِن خرابیوں کا کُلّی انسداد کسی طرح نہیں ہو سکتا،" سر سید کا کہنا تھا۔[1]

چنانچہ اُس کے بعد اُنہوں نے جو کوششیں کیں اور اُن سے جو نتائج بر آمد ہوئے، اُن سب کا فوری محرک یہی چھوٹا سا واقعہ تھا۔

علیگڑھ کالج اور یونیورسٹی، بر صغیر کے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی کی لہر، آل انڈیا مسلم لیگ اور ریاستِ پاکستان، اور وہ سب کچھ جو اِس کتاب میں بیان کیا جارہا ہے! وہ سب کچھ اُن صحیح اور غلط نظریات کی وجہ سے شروع نہیں ہُوا جنہیں ہمارے دانشور تاش کے پتوں کی طرح پھینٹ پھینٹ کر آپس میں بانٹتے رہتے ہیں۔ صرف کچھ یتیموں کے آنسو تھے جو ایک دردمند روح میں جذب ہو گئے۔

نظریات بعد میں آئے۔ جیسا کہ اُردو کے عظیم ناول نگار ابن صفی نے لکھا ہے، "صرف عمل اور ردِ عمل کا نام زندگی ہے۔ منطقی جواز تو بعد میں تلاش کیا جاتا ہے۔"[2]

*

دنیا سے غربت کو دُور کرنے کا خیال اُس زمانے میں دنیا کے اور بڑے لوگوں کے ذہنوں

---

[1] حالی، حیاتِ جاوید جلد اول، ص164-166

[2]

میں بھی تھا۔ اُن میں رُوسی ادیب لیو ٹالسٹائی، انگریز ناول نگار چارلس ڈکنز اور جرمن مفکر کارل مارکس سمیت نہ جانے کتنے بڑے بڑے ذہن شامل تھے۔ مقصد کے اعتبار سے اُن میں اور سیّد میں ایک مماثلت دیکھی جا سکتی ہے لیکن طریقِ کار میں ایک بنیادی فرق ہے۔

دُوسروں نے عموماً کوئی نہ کوئی نظامِ فکر تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ لیکن سیّد نے اپنی کوششوں کی بنیاد محبت کے صوفیانہ تصوّر پر قائم کی۔

بنگال میں مشہور سماجی شخصیت نواب عبداللطیف نے علمی ترقی کے لیے ایک سوسائٹی قائم کی تھی۔ اکتوبر ۱۸۶۳ء میں کلکتہ میں اُس تنظیم کے اجلاس سے فارسی میں خطاب کرتے ہوئے سر سیّد نے کہا کہ صوفیوں کے نزدیک محبت کے بیشمار مدارج ہیں، مثلاً:

۱ اُن لوگوں سے محبت جنہیں ہم جانتے ہیں (سر سیّد نے لیکچر میں اِسے شمار نہیں کیا لیکن اور جگہوں پر ذکر کیا ہے)

۲ قوم سے محبت

۳ انسانیت سے محبت

۴ تمام مخلوقات سے محبت

۵ پوری کائنات سے محبت، ”یہاں تک کہ اگر آسمان میں کہیں کوئی ستارہ بھی ٹُوٹے تو اُس کا درد ہمیں اپنے دل میں محسوس ہو!“

سر سیّد نے کہا کہ فوری طور پر دُوسرے درجے، یعنی قوم کی محبت، سے آغاز کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ محبت کا اِتنا معمولی درجہ ہے کہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے، مثلاً ”کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اگر ایک کوّے کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارے کوّے بے چین ہو جاتے ہیں؟“ اِس لیے، ”انسان ہو کر اگر ہم اپنے ہم مذہبوں اور اپنے ہموطنوں کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھیں، اور ہمیں اُن کے دکھ درد کا احساس نہ ہو، اور ہم اُن کی ہمدردی اور

اعانت نہ کریں تو ہم کوّے جیسی حقیر مخلوق سے بھی بدتر ہیں۔"[1]

یہاں سرسید نے "قوم سے محبت" میں "اپنے ہم مذہبوں اور اپنے ہموطنوں" دونوں کو شمار کیا تھا کیونکہ اول تو اُس زمانے میں عام رواج یہی تھا کہ ہندو، مسلمان اور ہر مذہب کے لوگ الگ الگ اپنے معاشروں کو ترقی دینے کی کوشش کرتے تھے، اور اُن کوششوں میں ایک دُوسرے کی مدد بھی کرتے رہتے تھے۔ سرسید بھی اپنے سامعین کو اُسی مروجہ رواج کے مطابق ہی عمل کرنے کی دعوت دے رہے تھے، جسے سامعین پہلے سے سمجھتے تھے۔ اِس لیے اُس موقع پر اِس بحث کی ضرورت ہی نہ تھی کہ قوم کی بنیاد مذہب ہے یا وطن!

دُوسری بات یہ ہے کہ جب دعوتِ عمل کا دائرہ اِتنا وسیع ہو کہ اُس میں اپنے گھر کے افراد سے لے کر پوری انسانیت، اور پوری کائنات کے تمام سیارے ستارے بھی شامل ہوں، تو اِس بات سے آخر کتنا فرق پڑ سکتا ہے کہ اُس عمل کے کس کس کی مدد کی جا رہی ہے؟ اگر ایک قدم پر صرف اپنے مذہب کے لوگوں کی مدد بھی کی جائے گی تو اگلے قدم پر پورے ملک کے لوگ بھی ہوں گے۔

اِس لیے عقل کی بات یہی ہو سکتی تھی کہ مسلمان، ہندو یا دُوسرے جس جس طرح اپنی مدد کروانا چاہتے ہیں، اُن کی مدد اُسی اُسی طرح سے کی جائے۔

اُس زمانے میں یہ کیفیت تھی کہ اونچی ذات کا ایک ہندُو کسی ایسے کنویں سے نکلا ہُوا پانی نہیں پی سکتا تھا جس کنویں سے کبھی کسی مسلمان نے بھی پانی نکالا ہو۔ ایسا کرنے سے اُس ہندو کی اونچی ذات ختم ہو جاتی تھی، جس کا مطلب مذہب سے محروم ہو جانا تھا۔ ان حالات میں صاف ظاہر تھا کہ اگر پورے ہندوستان کی بھلائی کے لیے بھی کام کرنا ہو تو اُس کی عملی صورت صرف یہی تھی کہ ہندُو اور مسلمان اپنے اپنے طور پر کام کریں، اور ایک

[1] سرسید احمد خاں، خطباتِ سرسید، ص49

دُوسرے کی دل کھول کر مدد کرتے رہیں۔ صدیوں سے یہی ہوتا آیا تھا، اور یہی ''وہ دِلرُبا تصویر باہمی اتحاد کی'' تھی، جسے نواب محسنُ الملک میں ۱۹۰۷ء میں اپنی اُس تقریر میں یاد دلایا جس کا حوالہ پچھلے باب میں آچکا ہے۔[1]

*

جب سر سید اِس نتیجے پر پہنچ گئے کہ لوگوں کی حالت سنوارنے کے لیے اُن میں تعلیم عام کرنے کی ضرورت ہے، تو اُنہوں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں تعلیم سے محرومی کی وجہ کیا ہے۔

۱۸۷۰ء میں اُنہوں نے انعام کا اعلان کر کے مسلمانوں سے اِس موضوع پر مضامین طلب کیے کہ مسلمان سرکاری تعلیم گاہوں میں کیوں نہیں جاتے، ان میں قدیم علوم کیوں گھٹ گئے ہیں اور جدید علوم کیوں رواج نہیں پا رہے؟

جو مضامین موصول ہوئے، اُنہیں ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ اُس نے تمام مضامین کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جن وجوہات کی بنا پر مسلمان سرکاری مدارس میں اپنی اولاد کو نہیں بھیجتے، اُن میں سے اکثر درست ہیں۔ سرکاری طریقۂ تعلیم مسلمانوں کی ضرورتوں کے لیے کافی بھی نہیں ہے۔ اِس لیے اگر حکومت مسلمانوں کے لیے اپنے طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلی بھی کر دے تب بھی مسلمانوں کی ضرورتیں رفع نہیں ہو سکتیں۔

چنانچہ ''مسلمانوں کو اپنے علومِ قدیمہ کے محفوظ رکھنے، علومِ جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کرنے کے لیے اِس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اپنی تعلیم کا فکر آپ کریں۔''[2]

---

[1]

[2] حالی، حیاتِ جاوید، جلد اول، ص224

اِس بنیاد پر کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کا اپنا کالج ہونا چاہیے، جس کا انتظام قوم کے ہاتھ میں ہو۔ قوم کے اِس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سر سیّد نے زبردست تحریک چلائی، چندہ اکٹھا کیا اور دُوسرے انتظامات کیے۔ اِس کام میں بعض ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا، جس کی کچھ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

۱۸۷۷ء میں اینگلو محمڈن کالج کے نام سے وہ کالج قائم ہُوا، اور سر سید کی وفات کے بہت عرصے بعد ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی بنا۔ چونکہ کالج علیگڑھ میں قائم ہُوا تھا، اِس لیے یہ پوری تحریک "تحریکِ علیگڑھ" کہلائی۔

اِس تحریک کے متعلق پھیلی ہوئی بعض غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلی غلط فہمی یہی ہے کہ کالج قائم کرنا سر سید کی اِنفرادی رائے تھی۔

جیسا کہ ہم نے یہاں دیکھا، یہ درست نہیں ہے۔ کالج قائم کرنا ایک اجتماعی رائے تھی۔ سر سید اِسے قوم کا فیصلہ سمجھتے تھے۔ اِس لیے اُن کے دل میں اِس فیصلے کی اطاعت کا جذبہ اِتنا شدید تھا کہ جب بعض قدامت پسند مولویوں نے یہ کہہ کر با اثر مسلمانوں کو کالج کی تعمیر میں حصہ لینے سے روکنے کی کوشش کی کہ سر سید کے مذہبی عقائد درست نہیں ہیں، تو سر سید نے اعلان کر دیا کہ وہ نصاب سازی کی کمیٹی میں شامل نہ ہوں گے۔ اُن کے الفاظ یہ تھے کہ "آپ مجھ کو اِس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کے مانند تصوّر کیجیے اور میری محنت و مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے، اور اِس وجہ سے کہ اِس کا بنانے والا یا اِس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے، اپنے گھر کو مت ڈھائیے۔"[1]

[1] سر سید احمد خاں، خطباتِ سر سید، ص 177-176۔ سر سید کے مذہبی عقائد کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کا بہت بڑا حصہ کم فہمی، بدنیتی اور غلط معلومات پر مبنی ہے۔ اس موضوع کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ حالی کی لکھی ہوئی سوانح، حیاتِ جاوید، کے دوسرے حصے کے گیارہویں باب سے شروع کیا جائے (جلد دوم، ص 178-65)

مولانا محمد علی جوہر نے، جو علیگڑھ کالج میں تعلیم حاصل کرنے والی پہلی جنریشن میں سے تھے، آگے چل کر کہا کہ سیّد کو نصاب سازی سے علیحدہ رکھنا اور بالخصوص ان کے مذہبی خیالات سے کالج کے طلبہ کو مستفید نہ ہونے دینا قوم کے امرا اور علمائے کرام کی سنگین غلطی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف بعض نوجوانوں نے اپنے ذاتی شوق کی وجہ سے ان کے مذہبی خیالات سے استفادہ کر لیا اور بعد میں صرف یہی نوجوان اپنی قوم کی کچھ خدمت کرنے کے قابل ہو سکے، جیسے جوہر خود یا علامہ اقبال (دونوں نے سیّد کے سلسلے سے وابستہ ہونے کا اعتراف کیا ہے)۔ لیکن چونکہ سیّد کے افکار نصاب کا حصہ نہیں بنے اس لیے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں وہ خرابیاں پیدا ہوئیں جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔[1]

دُوسری غلط فہمی جو تحریکِ علیگڑھ کے متعلق عام طور پر پھیلی ہوئی ہے، یہ ہے کہ سر سید کے نزدیک تعلیم بجائے خود کوئی مقصد تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ بھی درست نہیں ہے، اور سر سید کی نظر میں تعلیم صرف معاشرے سے دُکھ درد ختم کرنے کی طرف ایک ابتدائی قدم کی حیثیت رکھتی تھی۔

تیسری اور سنگین ترین غلط فہمی یہ ہے کہ سیّد نے مسلمانوں کو جدید تعلیم یا انگریزی تعلیم کی ترغیب دی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ علیگڑھ میں کالج بنانے کی وجہ یہ تھی کہ قومی کمیٹی اِس نتیجے پر پہنچی تھی کہ انگریزوں کے قائم کیے ہوئے تعلیمی ادارے مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ اِسی لیے مسلمانوں کا اپنا کالج تعمیر کرنے اور ملک بھر میں اسلامیہ اسکولوں، اسلامیہ کالجوں جیسے ادارے پھیلانے کی کوشش ہوئی۔ ورنہ صرف انگریزی یا جدید تعلیم کے لیے انگریزوں کے اپنے بنائے ہوئے اسکول کالج بہت تھے۔

---

[1] جوہر نے یہ بات کئی مواقع پر کہی، مثلاً 1929 میں کانپور میں علمائے سے خطاب؛ ثناءالحق صدیقی، ص 273-257

چنانچہ سر سید اور اُن کے ساتھیوں کی کوششیں انگریزی یا جدید تعلیم کے مقابلے پر "قومی تعلیم" کو فروغ دینے کے لیے تھیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سیّد کے مطابق انگریزوں کے قائم کیے ہوئے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ملنے والی تعلیم مسلمانوں کی تاریخ کے خلاف ایک ایسی نفرت پیدا کر رہی تھی جس کے نتائج تمام قوموں کے حق میں تباہ کن ثابت ہونے والے تھے۔

اِس لیے سر سید کے صاحبزادے سید محمود نے کالج بنانے والی کمیٹی کے سامنے فروری ۱۸۷۳ء میں ایک اسکیم پیش کی۔ اُس میں اُنہوں نے نہ صرف یہ کہا کہ کالج کو مستقبل میں یونیورسٹی بنانے کا خیال شروع سے سامنے رکھا جائے، بلکہ اِس بات پر بھی خاص زور دیا کہ یہ ادارہ حکومت کی مداخلت سے آزاد ہو ("بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگرانِ حال رہے، اور کسی قسم کی مداخلت گورنمنٹ کی اِس دارُالعلوم میں نہ ہونی چاہیے")۔ اُنہوں نے یورپ اور خود انگلستان کی بہترین یونیورسٹیوں کی مثالیں دیں، جن میں سے ایک میں وہ خود تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ ادارے بھی وہاں کی حکومتوں کی مداخلت اور انتظام سے آزاد ہیں:

> ...اور یہ بات اُن ملکوں کی ہے جہاں کی گورنمنٹ اُسی قوم کی ہے جس کی کہ تعلیم منظور ہے۔ پس یہ دلیل ہندوستان میں کس قدر زیادہ قوی ہو جاتی ہے جہاں کہ گورنمنٹ [اُن لوگوں پر مبنی ہے] جن کی زبان اور مذہب اور خیالات ہم سے مختلف ہیں۔[1]

*

اِس دوران، ۱۸۷۳ء میں، سر سیّد اپنے تصورِ محبّت کی وضاحت ایک اور دلچسپ وضاحت

---

[1] امین زبیری، سید محمود، ص 8-7

بھی پیش کر چکے تھے۔ یہ ایک مختصر کہانی 'گزرا ہوا زمانہ' تھی۔ ایک لڑکا خواب میں ایک آسمانی دلہن دیکھتا ہے جو کہتی ہے، "میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہُوں۔"

وہ عرب کے ایک دیہاتی (بدّو) کا حوالہ دیتی ہے، جس کے بارے میں روایات میں آیا ہے کہ اُس پیغمبرِ اسلامؐ سے دین کے بنیادی احکامات سننے کے بعد کہا، "خدا کی قسم نہ میں زیادہ کروں گا نہ کم"، اور پیغمبرؐ نے اُس کے متعلق جنّت کی بشارت دی۔ سر سیّد کے افسانے کی دُلہن کہتی ہے کہ جو شخص مذہبی فرائض اُس بدّو کی طرح پورے کر کے اپنی باقی ساری توانائی "انسان کی بھلائی اور اُس کی بہتری" میں صَرف کرے، وہ اِس دلہن کو حاصل کر لیتا ہے۔ وہ کہتی ہے:

> دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے، انسان ہی ایسی چیز ہے جو اخیر تک رہے گا۔ پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اُسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اُس کی موت اِن سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔

اُس کے بعد اپنا تعارف یہ کہہ کر مکمل کر دیتی ہے، "میں تمام انسانوں کی روح ہوں۔ جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے، انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں تو دل و جان سے ساعی ہو۔"

خواب سے بیدار ہونے پر لڑکا بے اختیار پکارتا ہے کہ "ضرور اُس دلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا، او خدا تو میری مدد کر، آمین!"[1]

---

[1] سر سید احمد خاں، مقالاتِ سر سید، حصہ پنجم، ص260-262

اِسے ایک طرح سے اُس ادبی تحریک کا نصبُ العین بھی سمجھا جا سکتا تھا جو خاص سر سیّد کے اثرات سے پیدا ہو رہی تھی۔ بعد میں اُس تحریک کو برصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ یعنی نئی زندگی بھی کہا گیا اور علامہ اقبال اُس کا سب سے بڑا حوالہ بنے۔

لیکن اُس ابتدائی زمانے میں اِس تحریک کی ایک اہم ترین نظم مولانا حالی کی مسدّس مدوجزرِ اسلام تھی، جس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۹ء میں، اور حتمی ایڈیشن ۱۸۸۶ء میں سامنے آیا۔ اسلامی تاریخ اور تہذیب کا علم جو پہلے صرف علمأ اور ماہرین تک محدود تھا، اِس نظم کے ذریعے عوام کی دسترس میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ پیغمبرِ اسلامؐ کی شخصیت کے بیشمار عالیشان پہلوؤں میں سے اِس پہلو کو اُن کا خصوصی تعارف بنا کر پیش کیا گیا کہ آپؐ کا لقب رحمۃ اللعالمین تھا، اور آپؐ کمزوروں کی مدد کرتے تھے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ[1]

اُس زمانے کے فارسی اور اُردو کے سب سے بڑے شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب، جن کا انتقال ۱۸٦۹ء میں ہُوا، پہلے ہی ادب کے لیے ایک نئی بنیاد فراہم کر گئے تھے:

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کُفر
کعبہ مِرے پیچھے ہے، کلیسا مِرے آگے

اب زندگی کے نئے تقاضوں نے اِسی بنیاد پر ایک شاندار عمارت اُٹھا دی۔ سر سیّد کے اپنے حلقۂ اثر سے باہر بھی اُردو ادب کے آسمان پر اِتنے ستارے اُبھر آئے کہ سب کا شُمار کرنا

1

آسان نہیں ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) اور توبۃ النصوح (۱۸۶۹ء)، اور مولانا محمد حسین آزاد کی نیرنگِ خیال (۱۸۸۰ء) جیسی کتابوں نے لوگوں کے سوچنے کے انداز بدل دیئے۔

خاص پرانے رنگ میں بھی ایسی کہانیاں لکھی گئیں جو تخیل کو مزید آگے لے جاتی تھیں۔ اُن میں سے پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ شائع ہونے والی فسانۂ آزاد کلاسیک میں شمار ہوتی ہے اور ایک ہندو کے قلم سے پیدا ہونے کی وجہ سے یہ اُس پرانی روایت کی یادگار بھی ہے جب پڑھے لکھے ہندُو عربی، فارسی اور اُردو میں مسلمانوں جیسی ہی مہارت رکھتے تھے۔ محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر کی طلسمِ ہوشربا جو ۱۸۸۱ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیان کئی جلدوں میں شائع ہوئی، داستان گوئی کے صدیوں پرانے اور مٹتے ہوئے فن کو محفوظ کرنے کی ایک کوشش تھی۔ لیکن یہ کوشش پرانی داستانوں سے بہت آگے بڑھ گئی اور بعض بالکل نئے خیالات کو پیدا کرنے کا سبب بنی۔

*

سرسید نے مسلمانوں کی بہتری کے لیے جو کوششیں کیں، اُن میں نہ صرف انگریزوں بلکہ ہندوؤں نے بھی ساتھ دیا۔

اُس زمانے کے مسلمان اِس سلسلے میں جن ہندوؤں کے خاص طور پر شکرگزار تھے لیکن جنہیں اب بھلا دیا گیا ہے، اُن میں لالہ لوک مند داس، بابو جگندر ناتھ، بابو طوطا رام، درشن سنگھ، ملھکی رام، پنڈت مالک رام اور راجہ کشن داس شامل ہیں۔

ان میں سے راجہ جے کشن داس تو خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ سر سیّد کے معتمد دوستوں میں سے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں اُن کی وفات پر کالج ایک دن بند رہا۔ اُن کے نام پر میڈل جاری کیا گیا اور ایک ہوسٹل کا نام اُن کے نام پر رکھا گیا۔

جیسا کہ اِن تمام باتوں سے توقع کی جا سکتی ہے، علیگڑھ کالج میں ہندُو طلبہ کو بھی داخلہ دیا جاتا تھا۔ ہاسٹل میں بھی ہندُو طلبہ کے لیے خصوصی انتظام تھا کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ جے کشن داس نے اپنی جیب سے ایک وظیفہ بھی جاری کیا تھا جو علیگڑھ کے ہندو طلبہ کے لیے مخصوص تھا۔

لیکن ہندُو معاشرے میں بعض بالکل ہی دُوسری قسم کی تحریکیں بھی اُبھر رہی تھیں۔ ۱۸۷۵ء میں سوامی دیانند سرسوتی کی کتاب ستیارتھ پرکاش شائع ہوئی۔ ہندی میں لکھی ہوئی اِس ضخیم کتاب میں کہا گیا کہ خدا نے ہندوؤں کی چار مقدس ویدوں کے سوا کوئی اور کلام نازل نہیں کیا ہے۔ انسانی تہذیب، ویدوں کی بدولت ہندوستان کی آریائی نسل نے شروع کی اور یہاں سے یہ تہذیب دنیا کے دوسرے حصوں میں پہنچی۔ ہندُومت کے سوا اور تمام مذاہب جھوٹے اور ساری تہذیبیں ناقص ہیں۔ مصنف نے صرف ہندُومت کی ایک نئی تشریح ہی پیش نہیں کی بلکہ عیسائیت اور اسلام پر سخت حملے بھی کیے۔[1]

اِس علمی اور ثقافتی نظریے کے پرچار کے لیے دیانند نے ۱۰/ اپریل ۱۸۷۵ء کو بمبئی میں آریہ سماج کی بنیاد رکھی، جس کی شاخیں جلد ہی ہندوستان کے دوسرے حصوں میں قائم ہونے لگیں۔

اُس زمانے میں یورپ میں بھی آریائی نسل کی برتری کا فلسفہ جنم لے رہا تھا جس نے آگے چل کر نازی ازم کی صورت اختیار کی۔ اِسی طرح ہندوستان میں آریہ سماجی سرگرمیوں نے آگے چل کر ہندُو مہاسبھا، سنگھٹن اور شُدھی کی تحریکوں کو جنم دیا۔ وہ تحریکیں موجودہ بھارت کی اکثر انتہاپسند تنظیموں کی مورثِ اعلیٰ بھی ہیں، جن میں بھارتیہ

[1] آریہ سماج کے بارے میں معلومات کے لیے خاص طور پر مندرجہ ذیل کتابیں سامنے رکھی گئی ہیں:
Dayanand, *An English Translation of the Satyarth Prakash* and *Light of Truth*. Har Bilas Sarda, *Life of Dayanand Sarswati World Teacher*. J T F Jordens, *Dayananda Sarasvati, His Life and Ideas.*

جنتا پارٹی (بی جے پی) شامل ہے۔

آریہ سماج کے فلسفے اور اُس سے پیدا ہونے والی تحریکیں اگرچہ بظاہر ہندُومت کے بارے میں بڑی پُرجوش معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں اِنہیں بالواسطہ طور پر انگریزی تعلیم کے اُن اثرات کا ثمر قرار دیا جاسکتا ہے جن کا تفصیلی ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے، مثلاً انگریزی تعلیم کی وجہ سے ماضی کے مسلمان بادشاہوں کے خلاف نفرت پیدا ہو رہی تھی۔

چنانچہ بظاہر قدامت پرست دکھائی دینے کے باوجود آریہ سماج کا فلسفہ ہندُو دھرم کی اُس قدیم روح کا نمایندہ نہیں تھا جو انگریزی تعلیم رائج ہونے سے پہلے برصغیر میں موجود تھی (اور یہی بات ہندُو انتہا پسندی کی موجودہ تحریکوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے)۔

قدیم ہندُومت کی رُوح نے صدیوں تک ہندُو مسلم دوستی میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ اُسی ہندُو دھرم کا ایک ایسا پہلُو بھی تھا جس نے ہزاروں سال تک برصغیر میں ذات پات کے ایک ظالمانہ نظام کو قائم رکھا۔ لیکن اُس اصلاح انگریزی تعلیم رائج ہونے سے پہلے ہی بعض صاحبِ بصیرت رہنماؤں نے شروع کر دی تھی، جن میں راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۲ء سے ۱۸۳۳ء) سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

دُوسری طرف آریہ سماج کی بنیاد جس نسل پرستی میں تھی، اُس کے علمی اثاثے واضح طور پر مغرب سے درآمد کیے گئے۔ یورپی مستشرقین عام طور پر یہی کہتے تھے کہ آریائی نسل کی کئی شاخیں ہیں، جن میں یورپ کی بعض قومیں، قدیم ایرانی اور اُونچی ذات کے ہندُو شامل ہیں۔

چنانچہ اُسی زمانے کے امریکہ میں جب اِس غرض سے قوانین بنے کہ ایشیا سے نقل مکانی کر کے وہاں آنے والوں کو روکا جائے تو وہاں پہلے سے موجود ہندوستانیوں نے عدالتوں سے فیصلے صادر کروائے کہ ہندوستانی حقیقت میں سفید فام نسل سے رکھتے ہیں۔

یہ سلسلہ ۱۹۲۳ء تک جاری رہا۔[1]

*

مذہبی اور نسلی برتری کی ناخوشگوار بحثوں سے الگ تھلگ، ہندوستانیوں کا ایک لبرل طبقہ بھی وجود میں آ چکا تھا۔ یہ اُن لوگوں پر مشتمل تھا جن کے دلوں میں انگریزی تعلیم نے تعصب کے بجائے ایک اور ہی خیال پیدا کیا تھا۔

یورپ میں ہر ملک ایک علیحدہ وجود تصوّر ہوتا تھا، اور اُس میں رہنے والے ایک قوم سمجھے جاتے تھے۔ تو پھر ہندوستان کو بھی کیوں نہ ایک ملک سمجھا جائے، اور تمام ہندوستانیوں کو ایک قسم تسلیم کیا جائے؟ ضرور یہی حقیقت ہے، جس سے ہندوستان کے تمام لوگ اِس لیے بیخبر ہیں کہ وہ تعلیم سے محروم ہیں![2]

اِس نظریے نے ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں ایک سیاسی جماعت کو جنم دیا۔ اُس کا نام انڈین نیشنل کانگرس تھا۔ اِس میں انگریزوں، ہندُوؤں اور پارسیوں سمیت مختلف مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ لیکن افتتاحی اجلاس کے ۲۷ر نمایندوں میں سے صرف دو مسلمان تھے (اور ۱۹۱۹ء تک مسلمان عام طور پر کانگرس سے دُور ہی رہے)۔

کانگرس کے بنیادی مطالبات یہ تھے کہ ہندوستان میں نمایندہ حکومت ہو، یعنی ہندوستانی خود اپنے نمایندے منتخب کریں۔ اور سِول سروِس کے امتحان جو اُس وقت صرف انگلستان میں ہوتے تھے، ہندوستان میں بھی ہُوا کریں تا کہ ہندوستانی بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں بیوروکریسی میں شامل ہو سکیں۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے، Desai & Vahed, *The South African Gandhi*

[2] مثال کے طور پر دیکھیے، INC, *Report of the Twentieth Indian National Congress,* pp.xi-xii

تاہم کانگرس کے لحاظ سے ہندوستان کو بدستور برطانوی سلطنت کا حصہ رہنا چاہیے تھا اور اقتدار انگریزوں ہی کے ہاتھ میں رہتا۔[1]

اِس کی وجہ یہ تھی کہ سیاست میں دلچسپی رکھنے والے ہندوستانیوں نے تقریباً ۱۸۳۳ء ہی سے یہ جان لیا تھا کہ برطانوی معاشرے میں بیک وقت اچھے اور برے رُجحانات پوری قوّت کے ساتھ موجود ہیں۔ برطانوی قوم سچے دل سے چاہتی ہے کہ ہندوستان اپنے پیَروں پر کھڑا ہو کر اپنی آزادی کی حفاظت کرنے کے قابل ہو سکے۔ لیکن بعض مفاد پرست انگریز نہیں چاہتے تھے کہ وہ دن جلد آئے۔ وہ بڑی بے دردی کے ساتھ ہندوستان کو لُوٹ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ عرصے تک جاری رہے۔

کانگرس جن لوگوں نے قائم کی تھی اُن میں سے تقریباً سبھی لارڈ میکالے کی اُس تقریر سے متاثر تھے، جو میکالے نے ۱۸۳۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں کی تھی۔ ۱۹۱۸ء تک کانگرس کے اکثر اجلاسوں میں اُس تقریر کا حوالہ دے کر میکالے کو ہندوستان کے سچے ہمدرد کے طور پر ہی یاد کیا گیا۔ میکالے نے کہا تھا، ’’ہمارے لیے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہندوستان کے عوام کسی اچھی حکومت کے سائے میں ہوں اور ہم سے آزاد ہوں، بجائے اِس کے کہ وہ ایک بری حکومت کے تحت جی رہے ہوں اور ہمارے تابع ہوں!‘‘ مستقبل کے حوالے سے اُس نے کہا:

> ہو سکتا ہے کہ ہم اچھی حکومت کے ذریعے ہندوستان کے عوام کی ایسی تربیت کر سکیں کہ اُن میں ہم سے بھی بہتر بہتر حکومت کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ مغربی علوم حاصل کرنے کے بعد کسی زمانے میں وہ جمہوری اداروں کا مطالبہ بھی کر دیں۔ وہ دن کبھی آئے گا یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ لیکن مَیں اُس

---

[1] INC, *Proceedings of the First Indian National Congress,* p.17

کے آنے میں رُکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کبھی نہیں کروں گا۔

کانگرس کی تحریک اِس اعتماد کے ساتھ شروع ہُوئی تھی کہ اگر بعض انگریز ایسے نسل پرست ہیں کہ معمولی غصہ آ جانے پر کسی ہندوستان کو جان سے مار دینا جائز سمجھتے ہیں، تو دُوسری طرف ایسے انگریز بھی موجود ہیں جن کی دو نسلیں لارڈ میکالے کی اِس تقریر کو ایک مقدس عہد کی طرح دہراتی آ رہی ہیں۔ اِس لیے ہندوستان کو ترقی دینے کے لیے اُن انگریزوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اِس کی ایک مثال یہ تھی کہ کانگرس کے قیام کے اگلے برس، ۱۸۸٦ء میں، ہندوستان کے بزرگ پارسی رہنما دادا بھائی نَوروجی نے لندن کے ایک حلقے سے لبرل پارٹی کے امیدوار کے طور پر برطانوی پارلیمنٹ کے انتخاب میں حصہ لیا۔ لندن میں اُن کی حمایت کرنے والوں میں مشہور سماجی کارکن فلورنس نائٹنگیل شامل تھیں اور ہندوستان اُن کی حامی تھی۔ انتخابی مہم کے دَوران نوروجی نے اپنے انگریز ووٹروں کو مخاطب کر کے کہا کہ اگرچہ وہ ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کے نمایندہ ہیں، لیکن وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ لندن کے ایک حلقے سے انتخاب لڑنے کے ناتے اُن پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے:

> ...یعنی اگر آپ مجھے منتخب کریں تو میری پہلی ذمہ داری یہ ہو گی کہ میں اِس حلقے کے ووٹروں کے مفادات کو مکمل اور بھرپور طور پر پیشِ نظر رکھوں۔ اِس لیے فی الحال میں ہندوستان کا مقدمہ آپ کے سامنے پیش نہیں کرنا چاہتا۔[1]

*

اگرچہ نوروجی اُس دفعہ کامیاب نہیں ہُوئے (اُنہیں ۱۸۹۲ء کے انتخاب میں کامیابی حاصل ہوئی)، لیکن تب بھی یہ واقعہ تھا جو حاکم اور محکوم قوموں کے درمیان باہمی اعتماد کی ایک

---

[1] Naoroji, *Essays, Speeches, Addresses and Writings,* pp.303-304

نئی مثال قائم کرتا تھا۔ مشکل کچھ اور تھی۔

کانگرس نے اپنے تصوّرِ قومیت کی بنیاد اِس مفروضے پر رکھی تھی کہ ایک ملک میں رہنے والے تمام لوگ ایک قوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ اُس زمانے کے علمی حلقوں میں یہی مفروضہ رائج تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ یہ درست ثابت ہوتا۔

کانگرس کے قیام سے چند برس پہلے، ۱۸۸۲ء میں، فرانسیسی مفکر ارنسٹ رینان دلائل کی مدد سے اِس خیال کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ اپنے مقالے ''قوم کیا ہے؟'' میں اُس نے کہا تھا، ''انسان نہ اپنی نسل کا غلام ہے، نہ اپنے مذہب کا، نہ دریاؤں کے بہاؤ کا اور نہ پہاڑوں کے رخ کا! بہت سے لوگ، جو صحت مند دماغ اور پرجوش دل رکھتے ہوں، ایک اخلاقی شعور پیدا کرتے ہیں جسے قوم کہا جاتا ہے۔''[1]

یہ بات وقت صرف آنے والا وقت ہی ثابت کر سکتا تھا کہ جغرافیائی قومیت کا وہ تصوّر درست ہے جسے کانگرس نے اپنایا تھا، یا وہ متبادل تصوّر جو رینان پیش کر رہا تھا۔

اتفاق سے وہ متبادل تصوّر ہندوستان ہی میں ایک اور تنظیم کی بنیاد بن رہا تھا۔ غالباً اُس تنظیم کے بانی رینان کے نظریات سے واقف نہ تھے لیکن بعد میں اُن کے فکری جانشین نے اُن کے نظریات کے دفاع میں رینان ہی کا حوالہ دیا۔ وہ فکری جانشین علامہ اقبال تھے، جنہوں نے ۱۹۳۰ء میں اپنے مشہور خطبۂ الٰہ آباد میں رینان کا قول نقل کیا۔ تنظیم کے بانی سر سیّد اور اُن کے احباب تھے، اور تنظیم کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس تھا۔

*

۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو سر سیّد نے علیگڑھ میں ہندوستان کے سرکردہ مسلمانوں کا اجلاس

1

منعقد کیا جس میں مختلف علاقوں سے اِکسٹھ لوگ آکر شریک ہوئے (کہا جاتا ہے کہ اقبال کے استاد مولوی میر حسن بھی گئے تھے)۔ اُن کے علاوہ انگریز اور ہندُو ہمدرد بھی موجود تھے۔ کالج کے اساتذہ اور طلبہ کو بھی شامل کر لیا گیا۔

جلسے کی صدارت کرتے ہوئے مولوی حاجی محمد سمیع اللہ خاں رئیس دہلی نے کہا کہ یہ ایک ایسا جلسہ ہے جس مثال اس سے پہلے مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ہے۔ کیونکہ اگرچہ اب بہت سے لوگ قوم کی تعلیم اور ترقی کے لیے کوشش کرنے لگے ہیں، ''مگر ہر ایک جگہ مختلف طریقے اس کے خیال کیے گئے ہیں اور اختیار کیے گئے ہیں۔'' اِس جلسے کا مقصد ایک ایسی تنظیم قائم کرنا ہے جو پورے برصغیر کے مسلمانوں کو آپس میں مشاورت کر کے اپنی تعلیم اور ترقی کے بارے میں متفقہ فیصلے کرنے کے مواقع فراہم کرے۔ کیونکہ ''اگر ہماری قوم آپس میں متفق ہو کر اور صلاح اور مشورہ کر کے اور ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہو کر کوئی مضبوط طریقہ قوم کی تعلیم اور ترقی کا اختیار کرے تو بلاشبہ قوم کے لیے بہت زیادہ مفید ہو۔''[1]

تنظیم کا نام اُس وقت ''محمڈن ایجوکیشنل کانگرس'' رکھا گیا لیکن چار سال بعد اُسے بدل کر ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' کر دیا گیا اور یہی نام مشہور ہُوا۔ تنظیم کے قیام کی قرارداد جو سرسید نے افتتاحی اجلاس میں پیش کی، وہ یہ تھی:

> مسلمانوں میں ہر قسم کی تعلیم کے تنزل کا لحاظ کر کے اور اِس خیال سے کہ اُن کی ہر قسم کی تعلیم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی اِمداد سے کوشش کی جاوے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال اِن اُمور پر غور کرنے کے لیے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے جو محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کے نام سے

---

[1] مولوی انوار احمد زبیری (مرتب)، خطباتِ عالیہ، ص 38-37, 27

موسوم ہو۔ یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص نہ ہو گا بلکہ ہر سال کسی ایسے مقام میں جہاں کے لوگ اِس جلسے کے منعقد ہونے کی خواہش کریں اور اِس کا انتظام منظور فرماویں، منعقد ہوا کرے گا۔

اس قرارداد کی وضاحت کرتے ہوئے سر سیّد نے کہا، "اِس وقت ہمارا یہ حال ہے کہ گو ہم ایک قوم مسلمان کہلاتے ہیں مگر ایک جگہ کے رہنے والے دُوسری جگہ کے رہنے والوں سے ایسے ہی ناواقف ہیں جیسے کوئی اجنبی قوم ایک دوسرے کے حال سے ناواقف ہو۔" اُن کے نزدیک اِس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ:

> کوئی ذریعہ ہمارے پاس ایسا نہیں ہے کہ مختلف اَضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں، ایک کے حال سے دُوسرے کو آگاہی ہو۔ ہم آپس میں مل کر اپنے خیالات جو قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ہوں، وہ دُوسروں پر ظاہر کر سکیں، ایک دُوسرے کے خیالات سے تبادلہ ہو۔ جو غلطی ہمارے خیال میں ہو، وہ دُوسروں کے خیال سے بخوبی اِصلاح پاوے۔

اِس لیے یہ تنظیم بنائی جارہی تھی تاکہ:

> آپس میں ملنے سے اور مختلف اُمور پر جو مذہبی تعلیم اور قومی ترقی سے علاقہ رکھتے ہیں، بحث مباحثہ یا تذکرہ و مذاکرہ کرنے سے ضرور ہے کہ کوئی عمدہ راہ قومی ترقی اور قومی تعلیم کی ہاتھ آوے۔ ہر ایک ضلعے کے لوگ جو مختلف راہیں چلتے ہیں، وہ سب سمجھ بوجھ کر ایک ایسا سیدھا رَستہ قومی تعلیم کے لیے اختیار کریں جو منزلِ مقصود کو پہنچانے والا ہو۔[1]

قرارداد متفقہ طور پر منظور ہُوئی اور قوم نے ایک نئے سفر کا آغاز کیا:

---

[1] سر سید احمد خاں، خطباتِ سر سید، ص 365-366

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

الطاف حسین حالیؔ

باب ۳

اجتماعی رائے

۱۸۸۷ء سے ۱۹۰۶ء

۱۸۸۷ء سے دنیا میں کئی ایسے رجحانات کا آغاز ہُوا جن کی تکمیل ۲۰۲۶ء میں ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ اُنہی میں برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کی وہ لہر بھی ہے جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے شروع ہوئی۔

جیسا کہ پچھلے باب کے آخر میں بیان کیا گیا ہے، اُس تنظیم کا بنیادی مقصد برصغیر کے مسلمانوں کو باہمی مشاورت کے ذریعے منظم کرنا تھا، اور وہ تنظیم ۱۸۸۶ء کے اختتام پر قائم ہوئی۔ اِس طرح ۱۸۸۷ء میں اُس کام کا آغاز ہُوا، اور مسلمانوں نے اگلے بیس برس تعلیمی اور ثقافتی قوتوں کو مجتمع کرنے میں گزارے۔ ملک بھر میں تنظیموں اور تعلیمی اداروں کا ایک جال سا بچھنے لگا جو عام طور پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ رابطے میں تھیں۔ ان میں سے پنجاب کی انجمن حمایتِ اسلام نے خاص طور پر شہرت حاصل کی ہے۔

خود کانفرنس کے سالانہ جلسوں نے بھی، جو مختلف شہروں میں ہوتے تھے، مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بڑا کام کیا۔ ۱۸۹۲ء کے اجلاس میں صدرِ جلسہ مولوی حشمت اللہ نے اِس پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا، ”دس اینٹوں میں کچھ نہیں ہے۔ جب ملا دیجئے، دیوار ہے۔ اِسی طرح قوم کی قوّت بڑھانے کو یہ پہلا جلسہ ہے۔“[1]

---

[1] مولوی انوار احمد زبیری، خطباتِ عالیہ، ص 73-70

اِس کانفرنس اور اُس زمانے کی دُوسری مسلمان تنظیم ہمارے زمانے کی تمام سیاسی، مذہبی اور غیر سرکاری (این جی او) تنظیموں سے مختلف تھیں کیونکہ ہمارے زمانے کی اِن تمام تنظیموں کے برعکس اُس زمانے کی مسلمان تنظیموں کسی پہلے سے طے شدہ پروگرام کو عوام سے قبول کروانے کی کوشش نہیں کرتی تھیں۔ اُن کے اجلاسوں میں ہر مسئلہ اِس غرض سے پیش کیا جاتا تھا کہ حاضرین اُس کے بارے میں جس مؤقف پر بھی متفق ہو جائیں، اُسے پوری قوم کی متفقہ رائے تسلیم کر کے اُسی کے مطابق عمل کیا جائے۔

بعض اوقات یہ مؤقف کسی تنظیم کے اپنے نقطۂ نظر کے خلاف بھی ہو سکتا تھا۔ اِس کی ایک دلچسپ مثال یہ تھی کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں مسلمان لڑکیوں کے لیے اسکول کھولنے کے سوال پر بحث ہوئی۔ سر سید احمد خاں نے مخالفت میں تقریر کی لیکن اکثریت نے لڑکیوں کے اسکول کھولنے کی حمایت کی۔ سر سید بخوشی اپنی رائے ترک کر کے لڑکیوں کی تعلیم کی کوششوں میں سرگرم ہو گئے۔

*

کانفرنس اور دُوسری تنظیموں کے اجلاسوں کی ایک خصوصیت اُن میں پیش کیے جانے والے لیکچرز اور اصلاحی نظمیں ہوتی تھیں۔ اِسے سر سید کی کوششوں کی کامیابی سمجھنا چاہیے کہ جو قوم تیس برس پہلے صرف عشقیہ شاعری اور بٹیر بازی میں دلچسپی لیا کرتی تھی، اب انہماک کے ساتھ اصلاحی نظمیں اور معلوماتی لیکچرز سنتی تھی۔ اَن پڑھ اور غریب عوام بھی اِس مشغلے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔

اِس طرح یہ تعلیمی جلسے قومی ادب کے لیے بھی ایک پلیٹ فارم ثابت ہوئے۔ اُس ادب پر سر سید احمد خاں کے افکار کا رنگ گہرا تھا، جسے مولانا حالی پہلے ہی علم و ادب کے اُفق پر بکھیر چکے تھے۔ ۱۸۸۷ء سے ۱۹۰۶ء کے عرصے میں اُنہی کے سجائے ہوئے اُفق پر نئے

ستاروں کی ایک کہکشاں نمودار ہو گئی۔ اکبر الٰہ آبادی، مولانا شبلی نعمانی، نواب محسن الملک، محمد علی جوہر، شیخ محمد اقبال (جو بعد میں علامہ اقبال کہلائے)، خوشی محمد ناظر، محمد دین فوق، مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور آغا حشر کاشمیری جیسے بیشمار نام عوام کے دلوں کی دھڑکن بنے۔

ہمارے زمانے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کی شاعری علیگڑھ تحریک اور سر سید احمد خاں کے خلاف تھی۔ اُس زمانے کے مسلمان ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنی قومی شاعری کے ارتقا کو اِس طرح دیکھتے تھے کہ مولانا حالی نے اسلامی تاریخ اور ثقافت کے ورثے کو جو پہلے علمائے کرام تک محدود تھا، مسلم عوام کے ہاتھ میں دے کر اُن میں خوداعتمادی پیدا کر دی۔ اکبر الٰہ آبادی نے اُس خوداعتمادی میں اضافہ کیا جب اُنہوں نے اپنی شاعری میں اُن لوگوں پر طنز کیا جو مغربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قوم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے:

واہ کیا راہ دکھاتے ہیں ہمارے مرشد　　کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا
رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم　　رنگِ مذہب میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

اِس طرح عوام کے دلوں سے تعلیم یافتہ طبقے کا رعب بالکل اُتر گیا اور وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو اونچے اونچے خیالات کے قابل سمجھنے لگے۔ اب انہیں ایک ایسی آواز کی ضرورت تھی جو اُن کے خوابوں کو عظیم فکری بلندی تک پہنچائے۔ ۱۹۰۰ء میں قومی افق پر اُبھرنے والے اقبال نے عوام کی یہ خواہش پوری کر دی۔[1]

[1] یہ موقف اقبال کے دوست نواب ذوالفقار علی خاں نے پیش کیا۔ دیکھیے Zulfiqar Ali Khan, *A Voice from the East*

*

مسلمانوں کی اِن کوششوں کو ایک بڑا دھچکا انڈین نیشنل کانگرس کی طرف سے لگا۔ کانگرس کے مطالبات اگرچہ نیک نیتی کے ساتھ کیے گئے تھے لیکن مسلمان انہیں اپنے مفاد کے خلاف پاتے تھے۔ اس کے علاوہ سرسید کو خطرہ تھا کہ کانگرس کی سرگرمیوں کی وجہ سے ملک میں رعایا اور حکمرانوں کے درمیان دشمنی بڑھ سکتی ہے، خود رعایا کے مختلف گروہوں مثلاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھی فساد پیدا ہو سکتا ہے۔

۱۸۸۷ء سے سرسید نے کھل کر مسلمانوں کو مشورہ دینا شروع کیا کہ وہ کانگرس میں شامل نہ ہوں۔ مسلمانوں کے ہر طبقے نے اِس مشورے پر عمل کیا۔ وہ قدامت پسند بھی جو دوسرے اکثر معاملات میں سرسید کی مخالفت کرتے تھے، اِس معاملے میں اُن کے ہمنوا ہو گئے۔ مسلمانوں میں سے صرف بعض تعلیم یافتہ افراد ہی کانگرس میں شامل ہوئے۔ اِس کے علاوہ پرانے خیالات کے اکثر ہندوؤں نے بھی سرسید سے اتفاق کیا۔[1]

وقت نے سرسید کے اندیشوں کی تصدیق کی، جیسا کہ اگلی دہائیوں میں ثابت ہُوا۔ جیسے جیسے کانگرس کی سرگرمیوں میں تیزی آئی، ہندو مسلم فسادات بھی بڑھتے گئے۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ ۱۹۳۰ء تک یہ فسادات عموماً برطانوی ہند تک محدود رہے یعنی اُن علاقوں میں جو براہِ راست انگریزوں کی حکومت میں تھے، اور کانگرس کی سرگرمیاں بھی انہی علاقوں تک محدود تھیں۔ دیسی ریاستوں میں شاذ و نادر ہی مذہبی فسادات ہوتے، اور یہ وہ

---

[1] میرٹھ میں لیکچر 16 مارچ 1888 کو دیا گیا؛ حالی، حیاتِ جاوید جلد اول، ص310-309۔ سرسید کی اس پالیسی کا سب سے مدلل دفاع محمد علی جوہر نے کانگرس کے اجلاس 1923 کے خطبۂ صدارت میں پیش کیا؛ زبیری، سیاستِ ملّیہ، ص41-38۔ اقبال نے 1909 کے لیکچر 'اسلام بحیثیت ایک سیاسی اور اخلاقی نصب العین' (انگریزی) میں بھی اسلام کے سیاسی اصول کی جو تشریح پیش کی وہ سرسید کی پالیسی کی تائید کرتی ہے؛ Sherwani, *op.cit.*, p.113-114

ریاستیں تھیں جنہیں انگریزوں نے مقامی حکمرانوں کی تحویل میں رہنے دیا تھا اس لیے وہاں کانگرس کی سرگرمیاں بھی نہیں تھیں۔[1] اُن ریاستوں میں ہندو مسلم فسادات کا رجحان ۱۹۳۰ء کے بعد بڑھا جب وہاں کانگرس نے اپنی سرگرمیاں پھیلائیں۔

اِس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اگرچہ کانگرس اِس دعوے کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی کہ تمام ہندوستانی ایک قوم ہیں لیکن وہ اِس دعوے کی کوئی علمی بنیاد فراہم نہ کر سکی۔ اُس کے رہنماؤں نے جب کبھی ہندوستانی قومیت کے لیے کوئی تہذیبی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی وہ اقلیتوں کو خارج کر بیٹھے۔ کانگرس کے بانیوں میں سے سریندر ناتھ بینرجی ایک ایسے غیر متعصب رہنما تھے جن پر مسلمان بھی اعتماد کرتے تھے۔ لیکن بینرجی بھی ”ہندوستانی قوم“ کا تعارف اِن الفاظ میں کروانے پر مجبور ہوئے کہ ”ہندوستانی یعنی ہندوستان کے ہندو، وہ قوم جس سے کہ میں خود ہوں۔“ یہ تعریف خود بخود مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو قومیت کے دائرے سے باہر کر دیتی تھی۔ بینرجی نے ہندوستانی تہذیب کو ”آرین نسل کی تہذیب“ قرار دیا، جس نے سنسکرت زبان بنائی تھی۔[2]

کانگرس کا ایک اہم مطالبہ یہ تھا کہ ہندوستان کی اشرافیہ کو اپنی حکومت کے نمایندے منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔ ایک بہت محدود پیمانے پر یہ مطالبہ ۱۸۹۲ء میں پورا ہُوا جب انڈین کونسلز ایکٹ نافذ ہوا۔ اُس زمانے میں لیجسلیٹو کونسل (Legislative Council) ایک طرح سے ہندوستان کی اسمبلی کی حیثیت رکھتی تھی، جس کے نمایندے وائسرائے خود نامزد کرتا تھا۔ ۱۸۹۲ء کے ایکٹ میں طے کیا گیا کہ کچھ نمایندے ہندوستانی خود نامزد کیا کریں گے۔ اگرچہ لفظ ”انتخاب“ استعمال نہیں کیا گیا اور نمایندوں کی نامزدگی کا اختیار

---

[1] مثلاً جوہر کا بیان؛ Anonymous, *India in 1931*-نیز-IRTC1, *Sub-Committee 3*, p.165 *32*.

[2] زبیری، سیاستِ ملیہ، ص 23

بھی بہت کم ہندوستانیوں کو حاصل ہُوا لیکن عملاً انتخاب کا اصول متعارف ہو گیا۔[1]

مسلمانوں نے محسوس کیا کہ یہ ایکٹ انہیں اپنے نمایندے منتخب کرنے کا حق نہیں دیتا کیونکہ ہندوستان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔اِس لیے ۱۸۹۶ء میں سر سید کے صاحبزادے سید محمود نے مسلمانوں کی ایک تنظیم کی طرف سے حکومت کو پیش کرنے کے لیے ایک میمورنڈم میں لکھا۔ اُس میں اُنہوں نے وہ اصول متعارف کروایا جسے بعد میں جداگانہ انتخاب اور جداگانہ نیابت (separate electorate) کہا گیا۔ سید محمود نے لکھا کہ انتخاب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ منتخب شدہ شخص انتخاب کرنے والوں کی نمایندگی کرے۔ لیکن برصغیر کی موجودہ حالت میں:

> لیجلسٹیو کونسل کے لیے بھی منتخب کرنے والے کثرت سے ہندو ہیں ... اور ہندو انتخاب کرنے والے اگر وہ کافی عقل رکھتے ہوں گے، تو وہ اُنہیں مسلمانوں کو منتخب کریں گے جن کے خیالات اُن سے بالکل یا تقریباً ملتے جلتے ہوں۔ اور اس طرح مسلمانوں کو معلوم ہو گا کہ اُن کے فرضی وکلاٗ جو درحقیقت ہندوؤں کی وجہ سے منتخب ہوئے تھے ایک ایسی پالیسی کی تائید کر رہے ہیں جس کو تمام مسلمان ناپسند کرتے ہیں۔

سید محمود نے تجویز کیا، ”انتخابی طریقہ کے ابتدائی اصول اِس بات کو چاہتے ہیں کہ مسلمان ممبروں کے انتخاب کے لیے مسلمان ہوں۔ اور ہندو ممبروں کے انتخاب کے واسطے ہندو۔“[2] سیدھے سادے الفاظ میں مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو حق ہونا چاہیے کہ وہ بھی اپنے نمایندے چُن سکیں۔ یہی وہ اصول تھا جو آنے والے پچاس برس تک مسلمانوں کی سیاسی حکمت عملی کا مرکز بنا رہا اور آخر کار پاکستان کے قیام کا ذریعہ بنا۔

---

[1] Singh, *Landmarks*, pp.198-205

[2] زبیری، انتخاب جداگانہ کا خلاصہ، ص13-15

*

یہ ایک فطری بات تھی کہ علمی اور مذہبی تحقیق بھی اِن سیاسی تبدیلیوں کو مخاطب کرتی۔ سر سید پہلے ہی خطباتِ احمدیہ کے ذریعے سیرتِ رسولؐ پر ٹھوس تاریخی انداز میں تحقیق کر کے ایک صحتمند بنیاد رکھ چکے تھے۔ ۱۸۸۷ء سے ۱۹۰۶ء کے عرصے میں مزید کئی علمی کارنامے سامنے آئے جن میں اسلامی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو جدید معیار اور تقاضوں کے مطابق ترتیب دے کر پیش کیا گیا، مثلاً مولانا حالی کی حیاتِ سعدی (۱۸۸۷ء) اور مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۲ء)، جسٹس سید امیر علی کی روحِ اسلام (The Spirit of Islam; 1892)، علیگڑھ کالج کے اُستاد سر ٹامس آرنلڈ کی دعوتِ اسلام (The Preaching of Islam; 1896) اور مولانا شبلی نعمانی کی المامون اور الفاروق (۱۸۹۸ء)۔

روائتی نقطۂ نظر سے لکھی جانے والی ایک مقبول تصنیف دیوبند سے تعلق رکھنے والے مولانا اشرف علی تھانوی کی بہشتی زیور (۱۹۰۶ء) تھی جس میں فقہ کے مسائل کو عوام کے لیے آسان انداز میں بیان کیا گیا تھا۔ اگرچہ اب اِس تصنیف کے قدامت پسندانہ پہلوؤں پر تنقید کی جاتی ہے لیکن اپنے زمانے میں یہ فقہ کے بنیادی مسائل عوام کی دسترس میں لا کر عوام کو مذہبی معاملات میں بااختیار بنانے کی ایک کوشش تھی۔ اِسی سے یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ روائتی علمائے کرام بھی معاشرے کے اُن تقاضوں کو محسوس کرنے لگے تھے جو علیگڑھ تحریک نے پیدا کیے تھے۔

اِس طرح یہ خیال مسلمانوں کے لیے ایک بنیادی حیثیت حاصل کر گیا کہ علمی اور مذہبی فکر کو بھی قومی ترقی کے مقصد کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اُس زمانے کی تعلیمی اور سماجی انجمنوں کے اجلاسوں میں دیئے جانے والے لیکچرز بھی، جنہیں عوام بہت شوق سے سنتے تھے، اِسی خیال کو فروغ دیتے تھے۔ اُن میں شاید سب سے بڑا کلاسیک نواب

محسن الملک کے اُس خطبۂ صدارت کو قرار دیا جا سکتا ہے جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ۱۸۹۳ء کے اجلاس میں پیش کیا گیا اور پمفلٹ کی صورت میں شائع ہو کر اِتنا مقبول ہُوا کہ اُس کی بازگشت بہت عرصے بعد تک اقبال کے اشعار میں سنائی دیتی رہی۔ محسن الملک نے کہا تھا کہ کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک قوم کو کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کسی رہنما کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اپنی خواہش سے قدرت کے اِس قانون کو تبدیل کر سکے، اِس لیے "کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ ہماری قسمت میں آیندہ کیا لکھا ہے۔ ہم اپنے مقصود پر کامیاب ہوں گے یا ہماری کوششیں ضائع اور رائیگاں جائیں گی۔ مگر جس راستہ پر ہم نے چلنا شروع کیا ہے وہ سیدھا راستہ ہے اور سیدھی راہ پر چلنے والا اگر برابر چلتا رہے، بلاشبہ منزلِ مقصود پر پہونچتا ہے۔"[1]

برصغیر کے مسلمان اُس زمانے میں اپنی تاریخ کے جس مرحلے سے گزر رہے تھے، اُسے محسن الملک نے ایک نئی شروعات قرار دیتے ہوئے کہا کہ جس طرح حضرت آدم علیہ السلام نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھایا تھا، اُسی طرح سر سید کے کہنے پر مسلمانوں نے علم کے درخت کا پھل چکھا، اور:

> جن لوگوں نے وہ پھل کھایا نیکی و بدی کو پہچاننے لگے۔ اور اُس گناہ میں غفلت اور بیخبری کی بہشت سے نکالے گئے... اب ہم ہیں اور طرح طرح کی تکلیفیں— قومی ہمدردی، قومی محبت، قومی ترقی، قومی تعلیم، قومی تربیت، قومی اصلاح اور خدا جانے کتنے عذاب!... مگر جب کہ ہم نے خود اِن مصائب کو قبول کیا، تو اُسے اب مردانہ وار برداشت کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ دوامی راحت اور لازوال خوشی ہم کو

---

[1] مولوی انوار احمد زبیری، خطباتِ عالیہ، ص ۸۰-۹۱

نصیب ہو جو نتیجہ اِن تکلیفوں کا اور ثمرہ اِن مصیبتوں کا ہے۔[1]

علم اور تحقیق کی یہی بنیادیں تھیں جن پر ۱۹۰۰ء کے بعد اقبال نے اپنی فکر کی عمارت تعمیر کی۔ وہ شروع ہی سے شاعری کے ساتھ ساتھ تحقیقی مقالے اور مضامین بھی تحریر کر رہے تھے، جن میں یہی قومی مقاصد پیشِ نظر تھے۔ ۱۹۰۴ء میں اُنہوں نے اپنی پہلی مکمل کتاب علمُ الاقتصاد کے دیباچے میں لکھا:

> اِس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دُکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک درد مند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرفِ غلَط کی طرح مِٹ جائے؟[2]

*

مسلمانوں کی اِن تمام سماجی اور علمی تیاریوں کے لیے ایک بھاری امتحان سر سید کی وفات کے بعد پیش آیا۔

۱۸۹۸ء میں سر سید کا انتقال ہُوا۔ دو تین برس تک قوم نے اِس طرح اُن کا سوگ منایا اور اُن کے پیغام کو زندہ کیا کہ ۱۹۰۱ء میں اُن کی جو سوانح حیات حالی کے قلم سے شائع ہوئی اُس کا عنوان ہی حیاتِ جاوید ٹھہرا یعنی ہمیشہ رہنے والی زندگی تھا۔ اور یہ عنوان بالکل موزوں معلوم ہُوا۔

لیکن اِسی دوران، ۱۹۰۰ء میں، یوپی کے گورنر سر انٹونی میکڈانل کی طرف سے یہ حکم

---

[1] ایضاً

[2] اقبال، علمُ الاقتصاد، ص 4-5

جاری ہو چکا تھا کہ سرکاری دفاتر میں اُردو رسم الخط کے بجائے ناگری حروف جاری کر دیئے جائیں۔ اِس اقدام سے ہندوؤں کو بھی کوئی فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا جو خود بھی ناگری حروف سے زیادہ اُردو رسم الخط ہی کے عادی تھے۔ اِس لیے مسلمانوں نے یہی سمجھا کہ اِس اقدام کا مقصد مسلمانوں کے قومی وجود پر حملہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔[1]

مجبوراً مسلمانوں کو ایک محدود پیمانے پر سیاست کے میدان میں قدم رکھنا پڑا۔ اِس کی صورت یہ تھی کہ اُنہوں نے علیگڑھ میں اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن اِس غرض سے قائم کی کہ مسلمانوں کا مطالبہ حکومت کے سامنے رکھا جائے۔ اگست ۱۹۰۰ء میں اِس کا ایک اجلاس لکھنؤ میں ہُوا جہاں محسن الملک نے اِس تنظیم کا مقصد یہ بیان کیا کہ "ہم اپنی زبان کو زندہ رکھ سکیں اور اگر خدانخواستہ وہ وقت آوے کہ اُس کو زندہ نہ رکھ سکیں تو اُس کا جنازہ تو دھوم سے نکالیں، ع: عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"۔[2]

یہ تدبیریں کارگر نہ ہوئیں۔ یوپی میں اُردو کی جگہ ہندی رائج ہو گئی۔ اُس کے بعد اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن بھی ختم ہو گئی لیکن مسلمانوں کے سامنے یہ سوال چھوڑ گئی کہ آخر اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟[3]

۱۹۰۳ء میں حکومت نے اعلان کیا کہ بنگال کا صوبہ بہت بڑا ہے۔ اس لیے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ بنگال میں اُس وقت ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ تقسیم کا مطلب تھا کہ بنگال کے مشرقی حصے پر مشتمل ایک نیا صوبہ وجود میں آئے گا اور وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی۔ ہندوؤں کی طرف سے بنگال کی تقسیم کے خلاف سخت احتجاج

---

[1] امین زبیری، تذکرۂ محسن، ص160-152

[2] ایضاً۔ یہاں اُس زمانے کے رواج کے مطابق مصرعہ نقل کرنے سے پہلے مصرعے کی علامت کے طور پر "ع" آیا ہے۔

[3] ایضاً

ہوا لیکن ۱۹۰۴ء میں بنگال کو تقسیم کر دیا گیا (اور یہ تقسیم ۱۹۱۱ء تک قائم رہی)۔

اِس ہنگامے کے دوران ملک میں ہندوستانی وطنیت کا سوال ابھر کر سامنے آیا۔ ۱۹۰۴ء ہی میں دو نغمے ابھرے جنھوں نے ہندوستانی وطنیت کے دو مختلف رنگ پیش کیے۔ اُن میں سے ایک اقبال کی وہ نظم تھی جو ستمبر اور اکتوبر میں اُردو کے بعض رسالوں میں شائع ہوئی:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

دوسرا گیت "بندے ماترم" تھا۔ یہ بنگالی میں تھا اور اِسے دسمبر میں کانگرس کے اجلاس میں ترانے کی طرح گایا گیا:

ماں! میں تیرے آگے جھکتا ہوں
رواں بہتی ندیوں والی
باغوں کی روشنی سے چمکتی ہوئی
مسرت کی ٹھنڈی ہواؤں والی
پراسرار کھیت لہلہاتے ہیں، اے ماں شکتی والی، اے ماں آزاد!

مسلمانوں میں، خصوصاً بنگال میں، تقسیم کی حمایت میں تحریک چلی کیونکہ نیا صوبہ بننے سے اُنہیں فائدہ پہنچ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ صوبہ ختم ہو جائے۔ ہندوؤں نے انگریزی مصنوعات بالخصوص کپڑے کے خلاف سودیشی تحریک بھی شروع کر رکھی تھی اور اُس کی وجہ سے بھی مسلمان تاجروں کو نقصان پہنچ رہا تھا۔

*

۱۹۰۶ء میں ایسے واقعات پیش آئے جنھوں نے مسلمانوں کو ایک فیصلہ کن قدم اٹھانے پر

مجبور کر دیا۔ یہ وہ سال تھا جب دنیا کے کئی ملکوں میں سیاست نے کروٹ بدلی اور برصغیر بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہا۔

اُس برس برطانوی وزیرِ ہند لارڈ مارلے کی طرف سے بعض ایسے اعلانات ہوئے جن سے واضح ہوتا تھا کہ انگریز ہندوستان میں آہستہ آہستہ اکثریت کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کانگرس نے اِس قسم کے اعلانات کو اپنی فتح سمجھا لیکن مسلمانوں کی بے اطمینانی بڑھ گئی۔

محسنُ الملک کے پاس ملک بھر سے خطوط آئے کہ مسلمانوں کو بھی اپنے نمایندے منتخب کرنے کا کچھ بندوبست کرنا چاہیے۔ محسنُ الملک نے مرحوم سر سید کے ایک اور قریبی ساتھی نواب مولوی مشتاق علی خاں وقار الملک سے، جو پہلے ہی ان معاملات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے، مشورہ کیا۔ علیگڑھ میں ایک کمیٹی بلائی گئی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ ملک بھر کے نمایاں مسلمانوں اور مسلم تنظیموں کی آراء جمع کر کے ایک میمورنڈم (memorandum) یعنی عرضداشت کو مرتب کیا جائے۔

صرف دو مہینے میں میمورنڈم مکمل ہو گیا اور ہندوستان بھر سے تقریباً پانچ ہزار دستخط جمع کر لیے گئے۔ ہر صوبے، طبقے اور خیال کے مسلمان اس میں شریک تھے۔ حیرت انگیز طور پر یہ ساری کارروائی اس خاموشی سے ہوئی کہ اخبارات کو خبر تک نہ ہوئی۔

مؤرخ امین زبیری نے اِسے "صرف نواب محسن الملک کی غیر معمولی شخصیت، قابلیت، محنت اور تنظیمی قوّت کا نتیجہ" قرار دیا ہے۔[1] یقیناً اِس میں شبہ نہیں۔ لیکن یہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی کامیابی کا پیمانہ بھی تھا۔ صرف بیس برس پہلے اُس کانفرنس کو قائم کرتے ہوئے سر سید نے کہا تھا، "اِس وقت ہمارا یہ حال ہے کہ گو ہم ایک قوم مسلمان

---

[1] امین زبیری، تذکرۂ محسن، ص168

کہلاتے ہیں مگر ایک جگہ کے رہنے والے دُوسری جگہ کے رہنے والوں سے ایسے ہی ناواقف ہیں جیسے کوئی اجنبی قوم ایک دوسرے کے حال سے ناواقف ہو۔" اور اب یہ حال تھا کہ ملک کے کونے کونے سے پانچ ہزار دستخط جمع ہو گئے اور محسن الملک کے سوانح نگار کے مطابق "تمام ہندوستان میں اُس وقت جس قدر با اثر و ممتاز اصحاب اور تعلیم یافتہ اہل الرائے تھے سب میں اتحادِ خیال و اتفاقِ رائے ہو گیا۔ صرف مدراس کے ایک صاحب سید محمد نے جو کانگرس کے نہایت سرگرم ممبر تھے کچھ اختلاف کیا تھا۔"[1]

اُس کے بعد ملک بھر سے مسلمان نمایندے اکٹھے کیے گئے جو اِس متفقہ عرضداشت کو وائسرائے کے سامنے پیش کریں۔ یہ بھی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاندار کامیابی تھی کیونکہ بیس برس پہلے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان ایسی نفرت اور دلوں میں اتنے شکوک و شبہات تھے کہ سرسید کو خوف رہتا تھا کہ کسی بھی سیاسی سرگرمی میں پڑتے ہی ایک طرف مسلمان بے قابو ہو جائیں گے اور دُوسری طرف انگریزوں کی بدگمانی میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن بیس برس تک تمام منفی جذبات کو برطرف کر کے اپنی تعلیم اور ترقی پر توجہ دینے کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں اور حکمرانوں کے درمیان باہمی اعتماد کی فضا قائم ہو چکی تھی۔

مسلمانوں کے وفد میں بھی "ہر صوبے کی نمایندگی رکھی گئی اور اُس کی صدارت کے لیے بالاتفاق ہزہائی نس سر آغا خاں منتخب ہوئے۔"[2] لیکن ایک اہم بات جس پر شاید کبھی توجہ نہیں دی گئی، اِس وفد کی کینیڈا کے نمایندوں کے اُس وفد کے ساتھ مماثلت ہے جو

---

[1] ایضاً۔ سید محمد سے مراد غالباً مولوی محمد یوسف ہیں جنھوں نے اُس برس کانگرس کے اجلاس میں نمایاں کردار ادا کیا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

[2] ایضاً

چالیس برس قبل ۱۸٦۷ء میں اِس غرض سے لندن میں اکٹھا ہُوا تھا۔ دونوں وفود کا مقصد اپنے منتشر حصوں کو ایک متحد سیاسی ڈھانچے میں لانا تھا۔ کینیڈا کی تاریخ کے اُس موڑ پر مرکزی کردار ادا کرنے کی وجہ سے سر جان میکڈانلڈ کو کینیڈا کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں ویسا ہی کردار محسن الملک نے ادا کیا۔

یکم اکتوبر ۱۹۰٦ء کو شملہ میں اِس وفد نے وائسرائے لارڈ منٹو سے ملاقات کی۔ وفد کی قیادت سر آغا خاں سوئم نے کی۔ عرضداشت میں مسلمانوں کا مطالبہ اِس بنیاد پر پیش کیا گیا کہ وہ برصغیر میں ایک علیحدہ اجتماعی وجود رکھتے ہیں، اور اُن کی تعداد کے علاوہ اُن کی تاریخی اہمیت کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ ایک طویل عرصے تک برصغیر کے حکمراں رہ چکے ہیں۔ اِس بنیاد پر مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ پیش کیا گیا:

> جو طریقہ نیابت و نمایندگی کا یورپ میں رائج ہے وہ اہلِ ہند کے لیے بالکل نیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کے بعض دوراندیش افراد کا خیال ہے کہ اس طریقے کو ہندوستان کی موجودہ تمدنی اور سیاسی حالت پر کامیابی کے ساتھ منطبق کرنے کے لیے نہایت حزم واحتیاط و مآل اندیشی سے کام لینا پڑے گا جو اگر نہ لیا گیا تو منجملہ اور خرابیوں کے ایک بہت بڑی خرابی یہ پیش آئے گی کہ ہمارے قومی اغراض کا سیاہ و سفید ایک ایسی جماعت کے حوالے ہو جائے گا جسے ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے۔[1]

لندن ٹائمز نے لکھا کہ اِس وفد نے ”مسلمانوں کی بیس سالہ سیاسی خاموشی کو توڑا ہے، وہ بیس سال جس کے دوران میں مسلمان سر سید احمد کی اِس نصیحت پر وفاداری کے ساتھ قائم

[1] زبیری، سیاستِ ملیہ، ص55-49

رہے کہ وہ اپنے آپ کو سیاسی تحریک [ایجی ٹیشن] میں شریک نہ ہونے دیں گے۔ اگرچہ اب انہوں نے منظم طور پر سیاسی کام شروع کیا ہے لیکن حقیقی معنوں میں وہ اُنہی کے مشورے پر پوری طرح چل رہے ہیں۔"[1]

*

دُوسری طرف مسلم رہنماؤں نے اپنے اگلے اقدام کے متعلق صلاح مشورہ کیا۔ بالآخر ایک سیاسی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ ہُوا، جس کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا نام تجویز کیا گیا۔ چونکہ انگریز حکومت اِیسٹر اور کرسمس کے موقع پر کئی دنوں کی چھٹیاں دیا کرتی تھی، اِس لیے ہندوستانیوں کے بڑے جلسے بھی عام طور پر انہی دنوں میں ہُوا کرتے تھے۔ مسلم لیگ کا افتتاحی اجلاس بھی دسمبر کے آخری ہفتے میں ڈھاکہ میں بلایا گیا۔

اُس سے ایک آدھ روز پہلے، یعنی ۲۵/ سے ۲۸/ دسمبر ۱۹۰۶ء تک، کلکتہ میں کانگرس کا بیسواں سالانہ اجلاس دادابھائی نوروجی کی صدارت میں منعقد ہُوا۔ اُس اجلاس کی سب سے اہم قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کے لوگوں کو اپنی حکومت خود منتخب کرنے کا اختیار ہونا چاہیے، جس طرح کینیڈا اور آسٹریلیا میں لوگ خود اپنی حکومت منتخب کرتے ہیں حالانکہ وہ بھی برطانوی سلطنت کی نوآبادیاں ہیں۔ انگریزی میں اِسے سیلف گورنمنٹ (self-government) کہا جاتا تھا۔ اُردو میں اِس کا ترجمہ "حکومتِ خوداِختیاری" اور ہندی میں "سَوراج" تھا۔

کانگرس نے واضح کیا کہ قرارداد کا مقصد ہندوستان میں برطانوی حکومت کو ختم کرنا نہیں بلکہ اُسے استحکام دینا ہے۔ نوروجی نے کہا کہ ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں "ہم

---

[1] زبیری، حیاتِ محسن، ص187۔ میں نے الفاظ میں ردوبدل کی ہے۔

برطانوی شہری ہیں اور ہم برطانوی شہریوں کے تمام حقوق کے مستحق اور دعویدار ہیں۔"
بنگال کے نمایندے ایم رمنّا نے کہا، "ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت چٹان جیسی مضبوط اور مستحکم بنیاد پر قائم ہو یعنی قوم کی محبت۔ ہم چاہتے ہیں کہ جب تک سورج اور چاند باقی ہیں، ہندوستان میں برطانوی سلطنت بھی قائم رہے۔" اِس بات کا اعتراف بھی کیا گیا کہ سیلف گورنمنٹ فوری طور پر نہیں مل سکتی بلکہ اس کے لیے بتدریج اقدامات کی ضرورت ہو گی۔[1]

یہ پہلا موقع تھا کہ نوجوان محمد علی جناح نے کانگرس کے اجلاس میں تقریر کی۔ کانگرس نے قراردادِ سَوراج میں "تعلیمی طور پر پسماندہ طبقوں کے حقوق کے لیے مناسب تحفظات" تجویز کیے تھے۔ مسلمان بھی اُنہی طبقات میں شمار کیے جاتے تھے، اِس لیے سب سے زیادہ اُنہی کے اندیشے دُور کرنے کے لیے قرارداد میں یہ الفاظ شامل کیے گئے تھے۔ لیکن جناح نے کہا، "کسی طبقے یا ملّت کے لیے کوئی تحفظات نہیں ہونے چاہئیں اور میرا تمام مدعا یہ ہے کہ یہ تحفظات قرارداد میں سے خارج کر دیئے جائیں۔"[2]

جناح نے "وقف علی الاولاد" (یعنی جائیداد کو اپنی اولاد کے لیے وقف کرنے کے اسلامی قوانین) کے متعلق ایک قرارداد کی حمایت میں بھی تقریر کی۔ چونکہ یہ خالص اسلامی قانون کا ایک مسئلہ تھا اِس لیے جناح نے کہا کہ اِس قرارداد سے ثابت ہوتا ہے کہ "ہم مسلمان اِس مشترکہ پلیٹ فارم پر برابری کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں اور انڈین نیشنل کانگرس کے پروگرام کے ذریعے اپنی شکایات کے تدارک کی درخواست کر سکتے ہیں۔"[3]

جناح کی مُراد یہ تھی کہ مسلمانوں کو اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم بنانے کی کوئی ضرورت نہیں

[1] INC, *Report 1906,* pp.17, 119
[2] *Ibid.,* p.120
[3] INC, *Report 1906,* pp.67-70

جو ٹھیک اُنہیں دنوں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے قائم کی جارہی تھی۔ اُس وقت کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایک دن یہ نوجوان اُسی تنظیم کی خاطر اپنے انفرادی وجود کو مٹاڈالے گا، اور مسلمانوں کے حقوق کے لیے خصوصی تحفظات جو اُس کے کہنے پر قرارداد سے خارج کیے گئے ہیں، اُن تحفظات کا دفاع کرنا بھی اِسی نوجوان کی تقدیر میں لکھا گیا ہے۔

*

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا بیسواں اجلاس ۲۷ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو شاہ باغ ڈھاکہ میں وہاں کے نواب سلیم اللہ کی احسن منزل میں شروع ہُوا۔ آخری دن کی کاروائی منسوخ کر کے ۳۰ر دسمبر کا دن سیاسی اجلاس کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ اُس سیاسی اجلاس کی صدارت نواب وقار الملک نے کی اور نواب سلیم اللہ خاں نے وہاں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی قرارداد پیش کی۔

قرارداد کے مطابق یہ مسلمانوں کی ایک سیاسی تنظیم تھی جس کا مقصد مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کے حق کو حاصل کرنا تھا۔ نواب سلیم اللہ نے کہا:

> جنہوں نے ہمارے حالات کا زیادہ گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اس نئی تحریک کو نیا آغاز نہیں بلکہ راستے کا ایک نیا موڑ سمجھیں گے۔ ابھی کل شام ہی ہم نے اپنی ایجوکیشنل کانفرنس کے بیسویں اجلاس کا کام ختم کیا، اور اگر سر سید احمد خاں مرحوم کی اس سے پہلے کی کوششیں بھی نظر میں رکھی جائیں تو ہماری اِس وقت کی کاروائی اُس کام کا ایک قدرتی مرحلہ ہے جو تقریباً نصف صدی پہلے شروع کیا گیا...
>
> آج ہم زمانے کے تقاضے کے مطابق ایک ملّت کے طور پر سیاسی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔ اسباب ایک مدّت سے تیار تھے لیکن صرف اب وقت آیا ہے کہ ہم اُن سے ایک ملّت کے تانے بانے بُن سکیں گے۔ اور لیگ کی رُوح ہمارے

شاعر کی رُوح ہو گی جس نے کہا تھا:

آزادہ رَو ہُوں اور مِرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے[1]

یہ شعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کا تھا۔ جیسا کہ دیکھا جا سکتا ہے، نواب سلیم اللہ نے اپنی تقریر میں ہندوستان پر تاجِ برطانیہ کے آغاز سے لے کر مسلم لیگ کے قیام تک مسلمانوں کی تاریخ کو دو اَدوار میں تقسیم کیا۔ تیاری کا زمانہ ۱۸۵۸ء میں تاجِ برطانیہ کی براہِ راست حکومت کے آغاز سے شروع ہو کر ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام پر ختم ہُوا۔ اُس کے بعد سفر کا پہلا مرحلہ ۱۸۸۷ء میں کانفرنس کی سرگرمیوں سے شروع ہو کر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام پر مکمل ہُوا (کتاب کے پچھلے باب اور موجودہ باب کی تقسیم اِسی لحاظ سے کی گئی ہے)۔

لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ دنیا کی کسی بھی دُوسری سیاسی جماعت سے مختلف تھی۔

سیاسی جماعت کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ کسی ایسے نظریے کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے جس پر پوری قوم متفق نہیں ہوتی اور وہ کسی مخصوص گروہ کا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ وہ گروہ اُس نقطۂ نظر کو فروغ دینے کے لیے جماعت کو وجود میں لاتا ہے۔

کانگرس اپنے آپ کو اِس تعریف سے مبرا سمجھتے ہوئے قومی تنظیم ہونے کا دعویٰ کرتی تھی لیکن وہ بھی اِس نظریے پر قائم تھی کہ ہندوستان ایک ملک ہے اور تمام ہندوستانی ایک قوم ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ اِس مفروضے کو قبول نہیں کرتا تھا اور کانگرس خود بھی تسلیم کرتی تھی کہ صرف تعلیم یافتہ

---

[1] Pirzada, *Centennary Souvenir,* p.134۔ قرارداد کا ترجمہ؛ حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۳۴

لوگ ہی اِس بات سے متفق ہوئے ہیں (اِس کی مثالیں پچھلے باب میں پیش کی جا چکی ہیں)۔

اِس کے برعکس مسلم لیگ صرف اِس نظریے پر قائم ہوئی کہ مسلمان ایک مخصوص کمیونٹی (ملّت) ہیں۔ تمام مسلمان یہ بات مانتے تھے۔ چنانچہ مسلم لیگ ایک قومی تنظیم تھی۔[1] سیاسی جماعتوں کے برعکس یہ کسی مکتبِ فکر کی نمایندہ نہیں تھی بلکہ اِس کے رہنماؤں کا کہنا تھا، ''اس کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے ہیں، وہ ایک ایسی مجلس ہے جہاں ہر قسم کی سیاسی رائیں آزادانہ ظاہر کی جاسکتی ہیں، اور اپنے قواعد وضوابط کے مطابق اس کے فیصلے کثرتِ رائے کے ذریعہ سے ہوتے ہیں۔''[2]

یہی وجہ ہے کہ جہاں دُوسری تمام سیاسی تنظیمیں قوم کے کسی مخصوص گروہ کی قائم کی ہوئی ہوتی ہیں، مسلم لیگ کو پوری قوم کی مشاورت کے ساتھ اور قوم کے متفقہ فیصلے کی بنیاد پر وجود میں لایا گیا تھا۔ کیونکہ یہ اُسی مشاورت کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی جس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔

اِس لیے مولانا محمد علی جوہر نے، جو اِس جماعت کے بانیوں میں سے تھے، اِس جماعت کے قیام کو قوم کی قدرتی نشو و نما کا نتیجہ قرار دیتے تھے، اور کانگرس کے ساتھ ایک دلچسپ موازنے کے ذریعے اِس کی وضاحت کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ چونکہ ایک نسلِ انسانی کی مدّت تیس سال کی سمجھی جاتی ہے، اِس لیے ''جس طرح کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں کے قیام کے تیس سال بعد ہندوؤں کی ایک نئی تعلیم یافتہ نسل تیار ہو کر کانگرس کی بانی ہوئی، اُسی طرح ۱۸۷۵ء سے علی گڑھ کالج کی بنیاد کے تیس سال

---

[1] قائداعظم نے اسے قومی تنظیم قرار دیا؛ Yusufi, *Speeches,* p.2108

[2] یہ 1930 میں علامہ اقبال کی صدارت میں ہونے والے مشہور سالانہ جلسے کے دعوت نامے کا اقتباس ہے؛ Malik, *The All-India Muslim League and*..., pp.95-100

بعد مسلمانوں کی ایک نئی تعلیم یافتہ نسل ۱۹۰۶ء میں تیار ہو کر مسلم لیگ کی بانی ہوئی۔"[1] بنگال کے عظیم ہندو رہنما چِت رنجن داس مسلم لیگ کے قیام کے وقت نواب سلیم اللہ کے مخالف تھے۔ لیکن دس گیارہ برس بعد اُنہوں نے بھی کہا، "وہ قوم کی رُوح تھی جو اُس لمحے مسلمانوں میں بول اُٹھی۔"[2]

دُوسرے لفظوں میں "تمام انسانوں کی روح" جسے سر سید کے ہیرو نے اپنے خواب میں ایک آسمانی دُلہن کے رُوپ میں دیکھا تھا، مسلم لیگ کے رُوپ میں ایک حقیقت بن کر ظاہر ہو گئی تھی:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا، وہ راز اب آشکار ہو گا[3]

---

[1] مولانا محمد علی، مولانا محمد علی جوہر آپ بیتی اور فکری مقالات، ص260-267

[2] Das, *India for Indians*, p.62

[3]

باب ۴

ایک نیا موڑ

۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۶ء

جب مسلم لیگ مشاورت کے اصول پر قائم ہوئی، عین اُسی وقت برطانیہ بھی اپنی سلطنت کو مشاورت کے اُسی اصول پر منظم کرنے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

بیس برس پہلے، ۱۸۸۷ء میں، برطانوی نو آبادیاں یعنی کالونیوں کے نمایندے، ایک تقریب کے سلسلے میں لندن میں اکٹھے ہوئے تو اُنہوں نے بعض باہمی معاملات کے متعلق آپس میں مشورہ کیا تھا۔ بظاہر وہ ثانوی نوعیت کے معاملات تھے، جیسے ٹیلی گرام اور ڈاک وغیرہ، لیکن اصل اہمیت یہ تھی کہ اُس سے پہلے اِس قسم کے تمام فیصلے برطانوی پارلیمنٹ خود ہی کرتی آئی تھی۔ اِس لیے وہ مشاورت برطانوی سلطنت کے لیے نیا آغاز ثابت ہوئی۔

اُس کے بعد کانفرنس (Cononial Conference) کے تین اور اِجلاس بھی اتفاقیہ طور پر ہی منعقد ہوئے۔

۱۹۰۷ء تک برطانیہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کانفرنس کو ایک مستقل ادارہ بنا دیا جائے۔ اُس برس لندن میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں ان کانفرنسوں کا نام بدل کر امپیریل کانفرنس (Imperial Conference) رکھا گیا، اور طے پایا کہ کانفرنس ہر چوتھے برس بلائی جائے اور اُس کے لیے باقاعدہ قواعد مرتب کیے جائیں۔ حکومتِ خود اختیاری رکھنے والی نو آبادیوں کو ”ڈومینین“ (dominion) یعنی مستعمرہ کہا جائے۔

برطانوی وزیرِاعظم سر ہنری بینرمین نے کہا، ”ہم اپنی بنیاد آزادی اور خودمختاری پر رکھ رہے ہیں۔ یہ برطانوی سلطنت کے داخلی تعلقات کی روح ہے۔“[1] ایک سابق وزیرِاعظم سر آرتھر بالفور نے کہا کہ یہ انسانی تاریخ میں بالکل نیا تجربہ ہے کہ ایک سلطنت نے اپنے مقبوضہ علاقوں کو آزاد ریاستوں کے ایک خاندان میں تبدیل کرنے کا آئیڈیل اپنایا ہے۔[2]

اِس نئے آئیڈیل کے لیے ”کامن ویلتھ“ یعنی دولتِ مشترکہ کا لفظ استعمال کیا گیا، جو پہلے ہی سے انگریزی زبان میں موجود تھا۔[3] لیکن کیا سفید فام نسل کے علاوہ دُوسری اقوام بھی اِس وحدت میں شریک ہو سکیں گی؟ ہندوستان کو ابھی تک اِن کانفرنسوں میں نہیں بلایا گیا تھا لیکن پھر بھی برصغیر کے لیے یہ سوال بہت اہم تھا۔ کیونکہ کانگرس کے مطالبۂ سَوراج کا مطلب بھی تو یہی تھا۔

*

بظاہر یوں دکھائی دیتا تھا کہ مسلم لیگ کا قیام سَوراج کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے کیونکہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا حق مانگا تھا۔ لیکن حقیقت میں مسلمانوں کا یہی اقدام ہندوستان کی آزادی کی راہ میں پیشرفت کا ذریعہ بن گیا۔

ایک تنازعے کا حل اُس وقت آسان ہو جاتا ہے جب دونوں فریق اپنا موٴقف کھل کر پیش کر دیں خواہ وہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ مسلم لیگ نے جداگانہ انتخاب کے مطالبے کو وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا تھا یعنی مسلمانوں کو اپنے نمایندے خود منتخب کرنے کا حق ہو۔ خوش قسمتی سے کانگرس میں اُس وقت نیک نیت اور پرخلوص رہنما موجود تھے۔ فروری ۱۹۰۷ء میں ہندو رہنما گوپال کرشن گوکھلے نے اپنے ہم مذہبوں سے کہا کہ اگر

---

[1] Colonial Conference 1907. *Minutes of Proceedings,* p.6

[2] Short, *The Mind of Arthur James Balfour,* p.121

[3] Colonial Conference 1907. *Minutes of Proceedings,* p.362

ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی اور ہندو اقلیت میں ہوتے تو "کیا عجب ہے کہ یہی اعتراض ہمارے دلوں میں خطور کرتا اور ہم بھی اسی خیال کو پیشِ نظر رکھتے اور اسی پالیسی پر عمل کرنے کو تیار ہوتے جس پر کہ اس وقت مسلمان عمل کر رہے ہیں!"[1]

بد قسمتی سے گوکھلے جیسے رہنماؤں کا اثر صرف تعلیم یافتہ ہندوؤں تک محدود تھا اور اُسی کے ساتھ ساتھ دُوسرے رجحانات بھی فروغ پا رہے تھے۔ مثلاً نسل پرست ہندوؤں کی طرف سے مسلم لیگ کی شدید مخالفت ہوئی۔ اُس کے مقابلے پر ہندو سبھائیں قائم ہونے لگیں، جن کی مرکزی تنظیم ہندو مہاسبھا تھی۔[2]

اِس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو گیا تھا جو دہشت گردی اور قانون شکنی کی طرف مائل تھا۔ تقسیمِ بنگال کو منسوخ کروانے کے لیے جو تحریک چل رہی تھی، اُس نے اِس رجحان کو مزید تقویت دی۔ ۱۹۰۹ء میں لندن میں مقیم ہندوستانی نوجوان مدن لال ڈِھنگرا نے ایک انگریز عہدے دار اور اُس کے پارسی ڈاکٹر کو قتل کر دیا، اور عدالت میں کہا کہ اگر ایک ہندوستانی کسی انگریز کو قتل کر دے تو کوئی بری بات نہیں ہے کیونکہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر رکھا ہے۔[3]

اِس قسم کی فضا تھی جس میں برطانوی حکومت نے نئی آئینی اصلاحات (Indian Councils Act 1909) نافذ کیں، جنھیں منٹو مارلے ریفارمز بھی کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کیا گیا لیکن ہندو مہاسبھا کی مخالفت کی وجہ سے پوری طرح نافذ نہیں کیا گیا۔[4]

---

[1] امین زبیری، سیاستِ ملیہ، ص75

[2] Indra Prakash, *A Review of the History,* pp.14-15

[3] Old Bailey Proceedings Online; retrieved 2 June 2019 from https://www.oldbaileyonline.org/browse.jsp?div=t19090719-55

[4] امین زبیری، سیاستِ ملّیہ، ص75-74

دو برس بعد دسمبر ۱۹۱۱ء میں شاہِ انگلستان جارج پنجم نے دہلی آکر ایک شاندار دربار لگایا اور تقسیمِ بنگال کو منسوخ کر دیا۔ ساتھ ہی دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا اعلان کیا۔ کانگرس نے بادشاہ کے شکریے کی قرارداد منظور کی اور بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کا لکھا ہوا نغمہ پیش کیا، جس کے ابتدائی الفاظ "جنا گنا منا" تھے (آزادی کے بعد سے یہ بھارت کا قومی ترانہ ہے)۔[1]

تقسیمِ بنگال کی منسوخی وہ واقعہ ثابت ہوئی جس کے بعد مسلمانوں نے انگریز حکومت پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا۔ یہ بددلی اِس وجہ سے بھی بڑھی کہ برطانیہ کی حلیف یورپی ریاستیں عرب، افریقہ اور بلقان میں عثمانی ترکوں کے ماتحت علاقوں پر حملے کر رہی تھیں۔

اِن حالات کے نتیجے میں ایک طرف برصغیر کے مسلمانوں نے متاثرہ مسلم ریاستوں کی اخلاقی اور مالی امداد کی۔ دُوسری طرف مسلم لیگ نے بھی حکومتِ خود اختیاری یعنی سَوراج کے مطالبے کو اپنے مقاصد میں شامل کر کے کانگرس کے ساتھ تعاون شروع کر دیا۔[2]

۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے مقاصد میں حکومتِ خود اختیاری کے مطالبے کے شامل ہوتے ہی محمد علی جناح بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اگرچہ اُنہوں نے کانگرس کی رکنیت بھی برقرار رکھی۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے وقت جناح اُس کے حق میں نہ تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جلد ہی گوکھلے کے اثر یا کسی اور وجہ سے اُن کی رائے بدل گئی۔ کیونکہ ۱۹۰۶ء کے بعد اِس موضوع پر جناح کی اگلی رائے ۱۹۰۹ء کے ایک اخبار میں ملتی ہے جہاں وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کی حد تک صرف مسلم لیگ ہی کے فیصلے کو تسلیم کریں گے خواہ اُن کی ذاتی رائے کچھ بھی ہو۔ اپنے اِسی مؤقف پر

[1] See, Sen, 'India's National Anthem'

[2] امین زبیری، سیاستِ ملّیہ، ص98

کہ برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمایندہ مسلم لیگ ہے، وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک قائم رہے۔

اِس طرح ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ میں شمولیت سے پہلے ہی وہ مسلم لیگ غیر مشروط حمایت شروع کر چکے تھے اور اُس جماعت میں اُن کے باقاعدہ طور پر شامل نہ ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُس صورت میں وہ ہندوستان کے لیے حکومتِ خوداختیاری حاصل کرنے کی جدوجہد میں حصہ نہ لے سکتے۔ ۱۹۱۳ء میں یہ رکاوٹ دُور ہوئی تو وہ باقاعدہ طور پر بھی لیگ میں شامل ہو گئے۔

*

۱۹۱۳ء تک برصغیر کے مسلمان نہ صرف ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی بلکہ دنیا کے دُوسرے اسلامی ملکوں کے دُکھ سُکھ میں بھی عملی طور پر شریک ہو چکے تھے۔ سیاست میں داخلے کے بعد محض چھ سات برس کی مدّت میں اِتنی سیاسی پختگی حاصل ہو جانا سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی شخصیات کی وجہ سے بھی تھا۔

۱۹۰۷ء کے بعد چند برسوں میں علم وادب کے پرانے ستارے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے جن میں حالی اور شبلی بھی شامل تھے۔ ۱۹۱۴ء میں اپنے انتقال کے وقت شبلی کئی جلدوں پر مشتمل سیرۃ النبی کے منصوبے پر کام کر رہے تھے جو بھوپال کی فرمانروا نواب سلطان جہاں بیگم کی سرپرستی کی وجہ سے ممکن ہُوا تھا۔ یہ کتاب جسے شبلی کی وفات کے بعد اُن کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا، ایک طرح سے اُس مہم کی تکمیل تھی جسے سرسید نے خطباتِ احمدیہؐ کے ساتھ شروع کیا تھا اور اِسے سیرتِ طیبہ پر دنیا کی بہترین کتاب سمجھا جا سکتا ہے۔

جو نوجوان پچھلے دس پندرہ برسوں میں علم وادب کے میدان میں نمودار ہوئے تھے،

اُن میں سے جو شخص اب علم اور سیاست کے شعبوں میں بیک وقت مسلمانوں کی سب سے مقبول شخصیت بن گیا وہ محمد علی جوہر تھے۔ ۱۹۰۷ء میں اُنہوں نے مسلم لیگ کا آئین بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اگلے چند برس میں انگریزی اور اُردو میں بالترتیب کامریڈ اور ہمدرد کے نام سے اخبارات جاری کیے۔ اقبال کے کلام اور فکر کو زیادہ سے زیادہ وسیع طور پر پھیلانا اُن کا ایک اہم مشن تھا کیونکہ اُن کے اپنے بیان کے مطابق اُنہوں نے قرآن کا پیغام کسی مولوی سے نہیں بلکہ اقبال سے سمجھا تھا۔[1]

اقبال نے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۱ء کے عرصے میں تین تحقیقی مقالوں میں ایک مکمل نظامِ فکر پیش کیا۔ یہ نو بنیادی اصولوں پر مبنی تھا: (۱) انسان کی اصل فطرت اُس کے ارادے میں مضمر ہے؛ عقل اور محسوسات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ (۲) انسان فطری طور پر نیک ہے۔ (۳) تمام برائیوں کا اصل سبب خوف ہے، جو خدا پر مکمل بھروسہ نہ ہونے یا اپنے ماحول سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ (۴) اِس لیے خوف کو ختم کر کے اِس دنیا میں مثالی معاشرہ بنایا جاسکتا ہے جو غربت اور ناانصافی سے آزاد ہو۔

یہ چاروں اصول اقبال کے لحاظ سے (۵) قرآن نے بھی پیش کیے تھے اور جدید یورپی تہذیب کی بنیاد بھی اِنہی پر تھی۔ اِس لیے اسلام اور جدید یورپ کے آئیڈیلز مشترک تھے خواہ یورپ کی سیاسی اور اقتصادی پالیسیاں اِن آئیڈیلز کے برعکس ہی کیوں نہ ہوں۔

ایک جیسے آئیڈیلز رکھنے والے معاشروں کی ساخت بھی ایک دُوسرے سے مختلف ہو سکتی تھی۔ اقبال کے لحاظ سے مسلم معاشرے کی ساخت تین عناصر پر مشتمل تھی۔ (۶) پہلا عنصر عقیدہ تھا یعنی اِس بات کا یقین کہ شروع سے لے کر آج تک مسلمانوں کے بنیادی عقائد وہی رہے ہیں جو پیغمبرِ اسلامؑ نے خدا کے آخری نبی ہونے کی حیثیت میں مسلمانوں

---

[1] جوہر، 'میر استاد اقبال' ہمدرد ۱۴/ اگست ۱۹۲۷ء؛ شاہجہانپوری، علامہ اقبال اور مولانا محمد علی، ص 92-83

تک پہنچائے تھے۔ (۷) اسلامی معاشرے کی ساخت میں دُوسرا عنصر یکرنگ ثقافت (uniform culture) تھی یعنی وہ علم وادب جو کم سے کم اپنے زمانے میں عوام اور خواص دونوں میں یکساں مقبول رہا ہو؛ ایک مسلمان صرف اُسی وقت اپنی قوم کی زندگی میں حصہ لینے کے قابل ہو سکتا تھا جب وہ اپنے باطن کو اِس قومی ادب کے رنگ میں رنگ لے، (۸) اور ظاہری طور پر اُس کا عمل اُن سیاسی اصولوں کے مطابق ہو جائے جو مسلمانوں نے صدیوں کے تجربے سے اخذ کیے ہیں۔

اقبال کے نظامِ فکر کا آخری نکتہ یہ تھا کہ (۹) اگر مسلم معاشرے کو باقی رہنا ہے تو اُسے ایسے افراد پیدا کرنے ہوں گے جو اپنے معاشرے کے اِن تینوں عناصر پر ثابت قدم رہیں اور نئے اثرات کو جذب کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے رجحانات کو اپنی قومی زندگی سے خارج کرتے رہیں جو اِن بنیادی عناصر کے لیے مضر ہوں۔[1]

اِن نکات کی بنیاد پر اقبال نے اجتماعی خودی کو ایک حقیقت قرار دیا۔ یعنی ''تمام انسانوں کی رُوح''، جس کا ذکر سر سید اور بعض صوفیائے کرام نے کیا تھا، اقبال کے نزدیک وہ محض ایک استعارہ نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ کچھ عرصے بعد یعنی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء کے عرصے میں اقبال نے اِس کے لیے ''خودی'' اور ''بیخودی'' کی اصطلاحات پیش کیں۔ خودی سے مراد رُوح کا ایک مخصوص تصوّر تھا، جس میں ارادے کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ بیخودی سے یہ مراد تھی کہ ایک فرد کی خودی اُس وقت مکمل ہوتی ہے جب وہ اپنی انفرادی خودی کو قوم کی اجتماعی خودی میں فنا کر دیتا ہے۔ یعنی وہ اپنے ارادے، نظریات اور محسوسات کو چھوڑ کر قوم کے اجتماعی ارادے، نظریات اور محسوسات کو اپنا لیتا ہے:

1

وجود افراد کا مجازی ہے، ہستیٔ قوم ہے حقیقی
فِدا ہو ملّت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا[1]

اِس میں تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، سر سید اور اُن کے ساتھیوں سے لے کر محمد علی جوہر اور محمد علی جناح جیسے نوجوانوں تک اُس زمانے کے اعلیٰ ظرف مسلمانوں کا طرزِ عمل یہی تھا۔

اِسی سماجی حقیقت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ دنیا کے دُوسرے مفکروں کے برعکس اقبال کو اپنا فلسفہ عوام کو سمجھانے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ اُن کے لحاظ سے یہ تمام نکات اسلام نے ایک اَن پڑھ مسلمان کے ضمیر میں بھی بٹھا رکھے تھے۔ اِس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ اقبال کی شاعری، جو اِنہی نکات پر مشتمل تھی، عوام میں بھی خواص سے کم مقبول نہ تھی۔ ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ شائع ہونے والی اقبال کی نظم ''ترانۂ ملّی'' سچ مچ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک قومی ترانے کی حیثیت اختیار کر گئی، جسے جلسوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ گایا جاتا تھا:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مُسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا[2]

اِس کے علاوہ اقبال کی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اُس میں ہمیشہ آنے والے واقعات کی جھلک ہوتی تھی۔ اُس زمانے میں عالمِ اسلام جن مصائب سے گزر رہا تھا اُن کے بارے میں اقبال نے بہت سی نظمیں لکھیں لیکن وہ محض دردناک سانحوں پر ردِ عمل کا اظہار نہ تھیں۔ بعض واقعات کی اقبال نے پیشین گوئی کی اور بعض واقعات کے بعد ناکامی

[1] اقبال، بانگِ درا، ص138

[2] اقبال، بانگِ درا، ص172

کو کامیابی میں تبدیل کرنے کے عملی طریقے بتائے:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہُوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

*

۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک یورپ میں پہلی جنگِ عظیم ہوئی۔ اِس میں پونے دو کروڑ سے زیادہ انسان ہلاک اور اُس سے زیادہ زخمی ہوئے۔ جنگ کی کل قیمت اُس زمانے میں قریباً دو ہزار ارب امریکی ڈالر تھی، جو ۲۰۲۵ء میں تقریباً ۳۷۴ کھرب امریکی ڈالر کے برابر ہیں۔

جنگ میں حصہ لینے والے ممالک دو گروہوں میں تقسیم تھے۔ مرکزی طاقتوں (Central Powers) نے جنگ میں پہل کی تھی، جن میں سب سے آگے جرمنی، آسٹریا-ہنگری، سلطنتِ عثمانیہ اور بلغاریہ تھے۔ اُن کے مقابل اتحادی طاقتوں (Allied Powers) میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، رومانیہ، سربیا، یونان، بلجئیم، مونٹی نیگرو، پرتگال، رُوس، امریکہ اور جاپان نمایاں تھے۔ آخر میں اِسی گروہ کو فتح حاصل ہوئی۔

اِس جنگ میں ہندوستانیوں نے برطانیہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ بڑی تعداد میں برطانوی فوج میں شامل ہوئے۔ مسلم لیگ اور کانگرس نے بھی برطانیہ کو بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ محمد علی جوہر نے کامریڈ میں لکھا کہ اپنے ارتقا کے موجودہ مرحلے میں ہندوستان کا "انگلستان کے زیرِ تربیت رہنا لازمی ہے اور... انگلستان کو ہماری ضرورت نہ بھی ہو تو بھی ہمیں تو اس کی ضرورت باقی ہے۔" لیکن ترکی کے ساتھ اُن کی ہمدردی کی وجہ سے اُنہیں اور ان کے بھائی شوکت علی کو وجہ بتائے بغیر نظر بند کر دیا گیا۔

ہندوستانی رہنماؤں کے لیے ایک تشویشناک بات یہ تھی کہ برطانوی سلطنت کی جن نو آبادیوں کو ڈومینین کا درجہ مل چکا تھا، اُنہوں نے کہا کہ آیندہ جنگ کا اعلان اور صلح کی

شرائط میں اُن سے بھی مشورہ لیا جائے۔ اِس طرح امکان پیدا ہو گیا کہ شاید تمام ڈومینینز پر مشتمل امپیریل پارلیمنٹ بن جائے۔[1] ہندوستان کے لیے یہ دوہری غلامی ہوتی۔ یعنی برطانوی پارلیمنٹ کے علاوہ کینیڈا، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور دُوسرے ڈومینین بھی امپیریل پارلیمنٹ کے ذریعے ہندوستان کی تقدیر کے فیصلے کرنے لگتے۔ گویا خودمختار ریاستوں کے خاندان کا تصوّر جسے اقبال سمیت برصغیر کے بہترین دماغ ایک عظیم آئیڈیل سمجھتے آئے تھے، یہاں ایک اُلٹا ہی رُوپ دھارنے والا تھا۔

*

دوہری غلامی کے اِس اندیشے کی وجہ سے ہندوستان میں یہ مطالبہ اور بھی زور پکڑ گیا کہ ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دے کر دُوسرے ڈومینینز کے برابر بنا دیا جائے۔

برطانیہ کی طرف سے ۱۹۱۹ء میں ہندوستان کے لیے ایک نیا آئین نافذ کیا جانا تھا۔ اُس میں حکومتِ خوداختیاری کو یقینی بنانے کے لیے مسلم لیگ اور کانگرس نے مل کر کچھ تجاویز مرتب کیں، جنہیں میثاقِ لکھنوٗ (Lucknow Pact) کہا جاتا ہے۔

یہ میثاق دسمبر ۱۹۱۶ء میں ہُوا جب جنگِ عظیم ابھی جاری تھی۔ چونکہ مسلمانوں کو خطرہ تھا کہ اگلے آئین میں جداگانہ انتخاب کا اصول ختم کیا جا رہا ہے، اِس لیے اُنہوں نے ہندوؤں کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی نشستیں پچاس فیصد یا اُس سے کم ہوں، اور وہاں بھی مسلمان ہندوؤں کی رضامندی کے بغیر حکومت نہ کر سکیں۔ لیکن بدلے میں لیگ نے کانگرس سے جداگانہ انتخاب کو میثاقِ لکھنوٗ میں شامل کر کے اِسے اگلے آئین کے لیے بھی یقینی بنا دیا۔[2]

---

[1] Jinnah, *An Ambassador of Unity,* p.53

[2] امین زبیری، سیاستِ ملّیہ، ص131-132

مگر سب سے اہم بات جسے اُسے وقت سب نے محسوس کیا لیکن آج بھلا دیا جاتا ہے، یہ تھی کہ مسلم لیگ کے ساتھ میثاقِ لکھنؤ کر کے کانگرس نے عملاً تسلیم کر لیا تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ سیاسی وجود رکھتے ہیں اور برصغیر کی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ یہ بات تسلیم کی جائے۔

اُس زمانے میں مسلم لیگ کا ایک مستقل صدر ہوتا تھا جو تین برس کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔ سالانہ اجلاس کا صدر علیحدہ ہوتا تھا جو صرف ایک سال کے لیے ہوتا تھا۔ ۱۹۱۶ء کے اجلاس کے صدر جناح تھے۔ اُنہوں نے اُس موقع پر جو خطبۂ صدارت پیش کیا، وہ اِس قابل ہے کہ اُسے غور سے پڑھا جائے۔ اُس میں اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ مسلم لیگ اِس بنیادی اصول پر قائم ہوئی کہ "ہندوستان کے آئینی ارتقا کے دوران جو بھی آئینی تبدیلیاں واقع ہوں، اُن سب میں مسلمانوں کے ملّی تشخص کو برقرار رکھا جائے اور اُسے کمزور نہ ہونے دیا جائے۔ جیسے جیسے اِس ملت کی سیاسی زندگی اور فکر آگے بڑھی ہے، ویسے ویسے اِس بنیادی اصول میں بھی نشوونما ہوئی ہے۔"[1]

سر یندر ناتھ بینر جی نے بھی، جو کانگرس کے بانیوں میں سے تھے، اور جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اِس موقع پر کانگرس کے اجلاس میں کہا، "آج کا دن ہماری تمام آیندہ نسلوں کو اُس دن کے طور پر ہمیشہ یاد رہنا چاہیے جس دن اپنے ملک میں حکومتِ خوداختیاری حاصل کرنے کے لیے ایک نئی مہم کا آغاز ہوا۔"[2]

گویا ہندوستان کی آزادی کی ایک مہم وہ تھی جو ۱۹۰۶ء میں قراردادِ سَوراج کے ساتھ شروع ہوئی تھی یا اُس سے بھی پہلے کانگرس کے قیام کے ساتھ شروع ہو گئی تھی، اور جس

---

[1] Jinnah, *An Ambassador of Unity,* p.21, 45

[2] INC, *Report of the Proceedings of the Thirty-First Indian National Congress*, p.76

کی بنیاد اِس مفروضے پر تھی کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم آباد ہے۔ ۱۹۱۶ء میں میثاقِ لکھنؤ نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ مفروضہ غلط تھا۔ گویا تیس برس پرانی کانگرسی سیاست کی بنیاد ہی بدل گئی، اور کانگرس نے سر سید اور مسلم لیگ کی اِس بات کو تسلیم کر لیا کہ مسلمان ایک علیحدہ سیاسی وجود رکھتے ہیں۔ اِس لیے آزادی کی یہ نئی مہم شروع کی جارہی تھی۔

جناح نے میثاقِ لکھنؤ میں جو اہم کردار ادا کیا، اُس کی وجہ سے اُنہیں "اتحاد کا سفیر" (Ambassador of Unity) کہا جانے لگا۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ اُس زمانے میں وہ مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی وجود کے قائل نہیں تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ میثاقِ لکھنؤ کی بنیاد ہی مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی وجود کو تسلیم کرنے پر تھی۔ یہ وہی اصول تھا جو بیس برس بعد قراردادِ لاہور کی بنیاد بنا، جیسا کہ ہم دیکھیں گے۔

اِس لیے یہ سمجھنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اُس وقت جناح کے خیالات کچھ اور تھے، جن کی وجہ سے اُنہوں نے میثاقِ لکھنؤ کروایا، اور بعد میں خیالات بدل جانے کی وجہ سے کوئی اور مطالبہ (مثلاً ۱۹۴۰ء میں قیامِ پاکستان کا مطالبہ) کر دیا۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ جناح اِن معاملات میں اپنی رائے کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ میثاقِ لکھنؤ کے موقع پر بھی اُنہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا، "انفرادی ترجیحات اجتماعی ارادے کی راہ میں نہ حائل ہو سکتی ہیں اور نہ انہیں حائل ہونا چاہیے ... میری ذاتی رائے جو کچھ بھی ہو لیکن یہاں میرا یہی فرض ہے کہ مسلمانوں کی کثیر التعداد جماعت کی رائے کی ترجمانی کروں جس کا آل انڈیا مسلم لیگ سیاسی آلہ ہے۔"[1]

اِس حوالے سے جن غلط فہمیوں کو آج خود جناح کے حامی بھی قبول کر بیٹھے ہیں، وہ بعد میں مسلم مطالبات کی مخالفت کرنے والوں کی طرف پھیلائی گئیں۔ مثلاً نومبر ۱۹۴۰ء میں

---

[1] Jinnah, *An Ambassador of Unity,* p.21, 45 ۔ زبیری، سیاستِ ملیہ، ص119

جناح، جو اُس وقت تک قائداعظم کہلانے لگے تھے، ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں پاکستان تقسیم کے مطالبے کی حمایت کر رہے تھے۔ کسی نے کہا، ”کم سے کم ۱۹۲۰ء سے پہلے مسٹر جناح اِس طرح نہیں سوچتے تھے۔“ جناح نے جواب دیا، ”۱۹۱۶ء سے! اُس وقت سے جب میثاقِ لکھنؤ منظور ہوا تھا، اِس بنیادی اصول پر کہ دو علیحدہ سیاسی وجود حقیقت رکھتے ہیں۔“[1]

[1] Yusufi, *op. cit.*, p.1268

باب ۵

راستے اور ہمسفر

۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۶ء

میثاقِ لکھنؤ کے باوجود ہندوستانی رہنماؤں کی یہ توقع پوری نہ ہو سکی کہ فوراً ہی حکومتِ خود اختیاری مل جائے۔

۱۹۱۹ء کے آئینِ ہند (The Government of India Act 1919) کے تحت، جسے مونٹیگو۔چیمسفورڈ اصلاحات بھی کہا جاتا ہے، اگرچہ عام انتخابات شروع کیے گئے اور محدود اختیارات منتخب نمایندوں کے سپرد بھی کیے گئے، لیکن ہندوستان کو حکومتِ خوداختیاری نہ دی گئی۔

البتہ میثاقِ لکھنؤ سے اِتنا فائدہ ضرور ہُوا کہ ۱۹۱۷ء ہی میں، جب وزیرِ ہند نے برطانوی پارلیمنٹ سے ہندوستان کے لیے یہ آئین منظور کروایا، تو پارلیمنٹ کے ہاؤس آف کامنز (دارالعوام) میں واضح اعلان کر دیا کہ "ہندوستان میں نمایندہ حکومت کو بتدریج ایک حقیقت بنانا" برطانوی پالیسی کا ایک حصہ ہے۔ اِس کا یہی مطلب سمجھا گیا کہ اگلے آئین میں، جو دس برس بعد متوقع تھا، ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دے دیا جائے گا۔[1] ۱۹۱۹ء میں شاہِ برطانیہ جارج پنجم نے اپنے ایک شاہی فرمان میں نسبتاً زیادہ واضح الفاظ میں کہا کہ

[1] Keith, *Speeches & Documents,* p.133

۱۹۱۹ء کا آئین "آئندہ مکمل ذمہ دار حکومت کی طرف راستہ دکھاتا ہے۔"[1]

کانگرس اور مسلم لیگ نے تو ناخوشی کا اظہار کرنے کے بعد نئے آئین کو قبول کر لیا تاکہ دس برس بعد ڈومینین کی حیثیت حاصل کی جا سکے، لیکن ہندوستان اور برطانیہ میں انگریزوں کے اونچے طبقے کے اُن حلقوں میں کھلبلی مچ گئی جو ہندوستان کو طویل مدت تک غلام بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔

اِن استعماری انگریزوں کی طرف سے خود اپنی حکومت کے خلاف زبردست ردِ عمل سامنے آیا۔ اِس میں وہ انگریز سرمایہ دار پیش پیش تھے جن کے مالی مفادات ہندوستان کو غلام رکھنے کے ساتھ وابستہ تھے۔ ان کی قیادت بمبئی کے سابق گورنر لارڈ سِڈنہام (Lord Sydenham) کر رہے تھے، جو اپنی نسل پرستی کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ۱۹۱۹ء کے آئین اور مستقبل کے بارے میں وعدوں کے ذریعے برطانوی حکومت ہندوستانیوں کی خواہ مخواہ طرفداری کر رہی ہے۔

اِن حالات سے ہندو انتہاپسندوں نے فائدہ اُٹھایا جنہیں کانگرس کے اعتدال پسند رہنماؤں نے اب تک کانگرس پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ اب اُنہوں نے بازی پلٹ دی اور کانگرس پر چھا گئے۔ اُنہیں ایک نیا رہنما بھی مل گیا جس کا نام گاندھی تھا۔

موہنداس کرمچند گاندھی نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ جنوبی افریقہ میں گزار کر بین الاقوامی شہرت حاصل کی تھی اور ہندوؤں میں اُنہیں ایک "مہاتما" یعنی زبردست روحانی شخصیت کی حیثیت حاصل تھی۔ اُنہوں نے کہا کہ اگر عوام حکومت کی نافرمانی کریں لیکن تشدد سے کام نہ لیں تو صرف ایک برس میں آزادی مل جائے گی۔

کانگرس کے اصل بانیوں میں سے جو اُس وقت زندہ تھے، اُنہوں نے واضح کیا کہ اِس

---

[1] *Ibid.*,pp. 328-329

قسم کے پروگرام سے آزادی حاصل نہیں ہو گی بلکہ اُلٹا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ہندوستان کے حالات اِتنے خراب ہو جائیں کہ دس برس بعد بھی حکومتِ خوداختیاری حاصل نہ ہو۔ لیکن انتہاپسندرہنماؤں نے، جو کانگرس پر اچانک چھا گئے تھے، کانگرس کو مجبور کر دیا کہ وہ گاندھی کے پروگرام کو اپنا لے۔

اِس لیے ۱۹۱۸ء میں ایک طرف کانگرس نے انتہاپسندوں کی قیادت میں اِس پروگرام پر عمل کرنے کی تیاری شروع کی، اور دُوسری طرف کانگرس کے اصل بانی اپنے پیروکاروں سمیت یہ کہہ کر کانگرس سے علیحدہ ہو گئے کہ "یہ انتہاپسند لارڈ سِڈنہام اور اُس کے ٹولے کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔"[1]

اِن علیحدہ ہونے والے رہنماؤں نے نیشنل لبرل فیڈریشن کے نام سے ایک جماعت بنائی، جسے ماڈریٹ پارٹی اور ہندوؤں کا اعتدال پسند طبقہ بھی کہتے تھے۔ اگرچہ یہ جماعت ۱۹۴۷ء تک قائم رہی لیکن ۱۹۲۶ء کے قریب، اپنے پرانے رہنماؤں کے دنیا سے رخصت ہونے پر، اِس کی پالیسی بھی ہندوؤں کی دُوسری جماعتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے لگی۔

اِس طرح ۱۹۱۸ء میں عملاً ایک نئی کانگرس وجود میں آ گئی۔ جماعت کا نام وہی رہا لیکن نہ صرف اُس کی روح بھی بدل گئی بلکہ اُس نے اپنے سابقہ رہنماؤں کو انگریزوں کے خوشامدی قرار دے کر اُن کے ورثے کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔

اِس فضا میں حکومتِ ہند یعنی ہندوستان کی برطانوی حکومت نے بعض ایسے بے تکے اقدامات کیے جن سے ظاہر تھا کہ وہ لارڈ سِڈنہام کے ٹولے کے دباؤ میں آ کر بوکھلا گئی ہے۔ ۱۹۱۹ء میں رولیٹ ایکٹ (Rowlette Act) کے نام سے ایک سخت قانون بنایا گیا جس کی کوئی ضرورت نہ تھی، اور اُسی برس ایک انگریز بریگیڈیئر جنرل ریجینالڈ ڈائر (Reginald

---

[1] NFL, *Report 1918*, p.41

(E. H. Dyer نے پنجاب کے شہر امرتسر میں جلیانوالہ باغ میں نہتے مظاہرین پر گولیاں چلا کر کم سے کم ۳۷۹/ افراد کو ہلاک اور ہزار بارہ سو کو زخمی کر دیا۔ اُن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔

اِس سانحے نے ہندوستانیوں کے انگریزوں پر اعتماد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا لیکن برطانیہ خود بھی اِس درندگی کی مذمت کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہا۔ وہاں کی پارلیمنٹ میں ۳۷/ کے مقابلے میں ۲۴۷/ ارکان نے ڈائر کے اقدام کے خلاف ووٹ دیئے۔[1] ڈائر کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا لیکن انگریزوں کے ایک مخصوص مالدار حلقے نے جس طرح اُسے قومی ہیرو قرار دے کر اُس کے قدموں میں دولت کے انبار لگا دیئے، اُس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ درحقیقت اُس نے کس کے مفادات کو آگے بڑھایا تھا۔

*

ہندوستان کے مسلمان بھی اِن حالات میں ہندوؤں کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ لیکن اُنہیں ہندوستان کی فکر کے ساتھ ساتھ عثمانی سلطنت کا غم بھی تھا جسے جنگِ عظیم میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران، ۱۹۱۷ء میں، انگریزوں نے فلسطینیوں سے ایک آزاد وطن کا وعدہ کر کے اُن کی مدد سے یروشلم فتح کیا جو اُس وقت عثمانی سلطنت کا حصہ تھا۔ لیکن جنگ کے بعد صیہونی تنظیم کی خواہشات کے مطابق وہاں ایک یہودی ریاست کے قیام پر غور کیا جانے لگا (جو بالآخر ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے نام سے وجود میں آئی)۔

چونکہ جنگ کے دوران برطانیہ کو ہندوستانی سپاہیوں کی ضرورت بھی پڑی تھی، جن

---

[1] Hansard, HC Deb 8 July 1920, vol. 131, "Army Council and General Dyer," Division No. 195: Ayes 37; Noes 247; Division No. 196: Ayes 129; Noes 230

میں مسلمان بھی شامل تھے، اِس لیے ہندوستانی مسلمانوں کو یقین دلا گیا تھا کہ جنگ کے بعد ترکی پر قبضہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن جنگ کے بعد اِس کے بر خلاف ترکی کے بھی حصے بخرے کر کے اُسے اتحادی طاقتوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اِن معاملات کے بارے میں برصغیر کے مسلمانوں نے تین مطالبات پیش کیے، جنہیں مسلم لیگ کی ایک قرارداد میں بھی بیان کیا گیا اور اُن کے حصول کی کوشش کو "تحریکِ خلافت" کا نام بھی دیا گیا۔ وہ تین مطالبات یہ تھے:

۱ اسلام کے مطابق مسلمانوں پر فرض ہے کہ جزیرۃ العرب کا علاقہ جس میں فلسطین بھی شامل ہے، اُن کے قبضے میں رہے۔ اس لیے اُس کے کسی بھی حصے، مثلاً فلسطین، پر غیر مسلموں کی حکومت قائم نہ کی جائے۔

۲ "خلافت" مسلمانوں کا مرکزِ شخصی (پرسنل سنٹر) ہے۔ چونکہ عثمانی سلطان کو کم سے کم سُنّی مسلمان خلیفہ بھی مانتے ہیں، اِس لیے اُس کے پاس اِتنی طاقت رہنے دی جائے کہ وہ جزیرۃ العرب کا انتظام سنبھال سکے۔

۳ ترکی کی آزادی برقرار رہنی چاہیئے۔[1]

اُسی زمانے میں مسلمانوں کی دو نئی سیاسی جماعتیں خلافت کانفرنس اور جمعیت العلمأ وجود میں آئیں۔ وہ مسلم لیگ پر دباؤ ڈالنے لگیں کہ اِن مطالبات کو انگریزوں سے منوانے اور ہندوستان کو بھی آزاد کروانے کے لیے گاندھی کی تحریک میں شرکت کی جائے۔

۱۹۱۹ء میں جناح مسلم لیگ کے مستقل صدر منتخب ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے اُصول کے مطابق فیصلہ مسلم لیگ پر چھوڑ دیا۔[2] لیگ کی کونسل نے بعض شرائط کے ساتھ

---

1 Afzal Iqbal, *Select Wrtings and Speeches,* Vol.2, pp.1-46

2 Pirzada, *Foundations of Pakistan,* Vol.I, p.544

عدم تعاون کے پروگرام کی حمایت کر دی۔ اگرچہ جناح اِس پروگرام کے اِس حد تک مخالف تھے کہ کچھ عرصے قبل جب کانگرس نے یہ پروگرام اپنایا تھا تو اُنہوں نے کانگرس سے استعفا دے دیا تھا لیکن مسلم لیگ سے وہ اب بھی علیحدہ نہ ہوئے۔ ۱۹۳۰ء تک وہ باقاعدگی کے ساتھ منتخب ہوتے ہوئے اِس جماعت کے صدر رہے۔[1] اِس دوران میں مسلم لیگ نے گاندھی کی تحریک میں بھی حصہ لیا، جیسا کہ اب ہم دیکھیں گے۔

*

۱۹۲۰ء میں گاندھی کی تحریک شروع ہوئی۔ اِسے ستیہ گرہ، عدم تشدد، خاموش مقابلہ، عدم تعان اور ترکِ موالات کے نام دیئے گئے ہیں (موالات کا مطلب تعاون اور ترکِ موالات کا مطلب عدم تعاون ہے)۔

برصغیر کی سیاست میں یہ واحد موقع تھا جب مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے کانگرس یا گاندھی میں سے کسی کا ساتھ دیا۔ اُن کی قیادت علی برادران کر رہے تھے، یعنی محمد علی جوہر اور شوکت علی (فرنگی محل سے سند لینے کے بعد ان دونوں کے ناموں میں "مولانا" کا اضافہ ہونے لگا تھا)۔ اُنہوں نے انگریز فوج کی نوکری کو حرام قرار دیا اور بغاوت کے جرم میں دو برس قید کی سزا پائی۔

گاندھی نے عدم تعاون کے لیے یہ طریقہ تجویز کیا تھا کہ ہندوستانی بتدریج حکومت کے نظام سے علیحدہ ہوتے جائیں۔ اس کے لیے وہ سرکاری خطابات اور اعزازات واپس کریں، سرکاری نوکریاں چھوڑ دیں، الیکشن میں حصہ نہ لیں، عدالتوں کا بائیکاٹ کریں، انگریزوں کے قائم کردہ اسکولوں اور کالجوں سے الگ ہو جائیں، غیر ملکی کپڑا اور سامان چھوڑ کر کھادی (کھدر) اِستعمال کریں، اور سرکاری تقاریب میں شرکت نہ کریں۔

[1] Afzal, *A History,* pp.34-36

اُس تحریک کے بہت سے واقعات مسلمانوں کی قومی یادداشت کا حصہ بن گئے۔ مسلمانوں نے کانگرس کو بھی چندہ دیا اور ترکوں کی مدد کرنے کے لیے بھی دل کھول کر قربانیاں دیں۔ پورے پورے خاندانوں نے فاقے کیے تاکہ رقم بچا کر ترکی بھیجی جائے۔ بہت سے لوگوں نے تو گھر بار بیچ ڈالے۔ اُس زمانے کی فضا پر اقبال جیسے شاعروں کے کلام کے ساتھ ساتھ ایک کم معروف شاعر اقبال سہارنپوری کا لکھا ایک نغمہ چھایا رہا، جسے نوحے کے انداز میں گایا جاتا تھا:

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

دُوسری طرف ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کے لیے ہزاروں مسلمانوں نے ماتھوں پر تِلک اور قشقے لگائے، رامائن کی پُوجا میں شریک ہوئے اور گائے کو ذبح کرنے سے گریز کرنے لگے۔ آریہ سماجی مبلغ سوامی شردھانند، جو اسلام کے خلاف زہر اُگلنے میں بہت آگے رہتے تھے، اُنہیں جامع مسجد دہلی کے منبر پر بٹھا دیا گیا۔ اِس قسم کے اقدامات کی تائید کرنے میں علمائے کرام بھی پیش پیش تھے۔[1]

یہ سب کچھ تھا لیکن تحریکِ عدم تعاون کبھی بھی تشدد سے خالی نہ رہی۔ پہلے دن ہی دہلی میں کارکنوں نے چھابڑی فروشوں پر حملہ کر دیا جو گاندھی کے حکم کے خلاف کھانے پینے کی چیزیں بیچ رہے تھے، اور کئی لوگ مارے گئے۔[2] اِس قسم کے واقعات پوری تحریک کے دوران پیش آتے رہے۔

آہستہ آہستہ تحریک دم توڑنے لگی کیونکہ ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی گاندھی کی بشارت کے مطابق ہندوستان کو آزادی حاصل نہ ہُوئی تھی۔ ۱۹۲۲ء

---

[1] امین زبیری، سیاستِ ملیہ، ص160

[2] Bamford, *Histories,* p.6

میں تشدد کے ایک واقعے کو جواز بنا کر گاندھی نے تحریک ختم کر دی۔ اُنہوں نے کہا، "خدا نے مجھ پر بے حد مہربانی کی ہے۔ اُس نے مجھے تیسری بار خبردار کیا ہے کہ ابھی ہندوستان میں سچائی اور عدم تشدد کا وہ ماحول پیدا نہیں ہوا۔"[1]

مسلمانوں کی اکثریت نے اُس کے بعد کبھی گاندھی کی کسی تحریک میں حصہ نہ لیا۔

*

لیکن گاندھی نے صرف مسلمانوں کو مایوس نہیں کیا تھا۔ اُنہوں نے کانگرس کی تیس سالہ محنت پر بھی صرف دو برس میں پانی پھیر دیا تھا۔

اصلی اور پرانی کانگرس نے ۱۹۰۶ء میں ہندوستان کے لیے حکومتِ خوداختیاری کا مطالبہ اِس بنیاد پر کیا تھا کہ ہندوستان کے عوام آزادی حاصل کرنے کے اہل ہو چکے ہیں۔ گاندھی نے ۱۹۲۲ء میں یہ کہہ کر کہ "ابھی ہندوستان میں سچائی اور عدم تشدد کا وہ ماحول پیدا نہیں ہُوا"، عوام کو آزادی کے لیے نااہل ثابت کر دیا۔ اِس طرح گاندھی نے اپنے خدا سے لارڈ سِڈنہام اور جنرل ڈائر کے اِس دعوے کی تصدیق کروا دی کہ ہندوستان کے عوام آزادی کی اہلیت نہیں رکھتے (خواہ سڈنہام اور ڈائر اُس اہلیت کی شرط سچائی اور عدم تشدد کے بجائے کچھ اور بتاتے ہوں)۔

دُوسری بات یہ تھی کہ پرانی کانگرس نے برطانوی سلطنت (دولتِ مشترکہ) میں رہتے ہوئے خوداختیاری حاصل کرنے کو مقصد قرار دیا تھا۔ یہ ایک ایسا معقول مطالبہ تھا کہ انگریز قوم اِسے مسترد کر ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ نوآبادیوں کو حکومتِ خوداختیاری دینا ایک معمول کی بات تھی۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۱۹ء تک برطانوی حکومت اور شاہِ

---

[1] ۱۶ فروری ۱۹۲۲ء کے ینگ انڈیا میں گاندھی کا مضمون

برطانیہ بھی اِسے اُصولی طور پر تسلیم کر چکے تھے۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں گاندھی کے کہنے پر کانگرس کے منشور میں سے "برطانوی سلطنت کے اندر" رہنے کی شرط ہٹا دی گئی، اور کہا گیا کہ حالات پر منحصر ہو گا کہ سوراج یعنی سیلف گورنمنٹ برطانوی سلطنت کے اندر رہتے ہُوئے حاصل ہو یا اُس سے علیحدہ ہو کر۔[1] اِس طرح گاندھی کی نئی کانگرس نے وہ اُصول ہی ختم کر دیا جس کے تحت پرانی کانگرس انگریزوں سے یہ وعدہ لے چکی تھی کہ ۱۹۲۹ء کے لگ بھگ ہندوستان کو آزادی مل جائے گی۔

تیسری بات یہ تھی کہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے ایک طویل جدوجہد اِس مقصد کے لیے بھی کی تھی کہ ہندوستان میں عام انتخابات ہوں اور دونوں جماعتیں اپنے نمایندے منتخب کروا کے حکومت میں حصہ لیں۔ ہندوستان میں عام انتخابات پہلی دفعہ ۱۹۱۹ء کے آئین ہی کے تحت ۱۹۲۰ء میں ہُوئے (اگرچہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر نہیں تھے اور ووٹ ڈالنے کا حق نسبتاً محدود تھا)۔ چونکہ کانگرس اور مسلم لیگ عدم تعاون کے حق میں فیصلے دے چکی تھیں، اس لیے دونوں میں سے کوئی بھی بحیثیت جماعت حصہ نہ لے سکی۔ اگرچہ مسلم لیگ کے بعض رہنماؤں نے آزاد اُمیدواروں کے طور پر حصہ لیا، جن میں جناح بھی شامل تھے، لیکن اچھے مسلمان رہنماؤں کی اکثریت گاندھی کے اثر کی وجہ سے اسمبلیوں سے دُور رہی۔ اِس خلاٗ کو پُر کرنے کے لیے بہت سے مفاد پرست سیاستداں میدان میں آئے اور مسلم سیاست پر اِس طرح چھا گئے کہ آج تک اُن کا اثر ختم نہیں کیا جا سکا ہے۔[2]

اِس طرح پرانی کانگرس نے تیس برس تک اپنی ہر غلطی سے سیکھتے ہوئے قدم بہ قدم آگے بڑھ کر برصغیر کی آزادی کے لیے جو راستہ متعین کیا تھا، وہ گرد میں گم ہو گیا۔

---

[1] INC, *Report 1920,* pp.46-67

[2] دیکھیے اقبال، آل انڈیا مسلم لیگ مینی فیسٹو

مسلمانوں کے ساتھ شراکت کے لیے جو اُصول طے کیے تھے،وہ ختم ہو گئے۔ اب ہندوستانیوں کے پاس مستقبل کے لیے کوئی لائحۂ عمل نہ تھا، سوائے اِس کے کہ وہ انتظار کریں کہ خدا کب گاندھی سے دوبارہ بات کرتا ہے۔

*

اِن حالات کے ردِ عمل مسلم اور ہندوؤں معاشروں میں ایک دُوسرے سے کافی مختلف انداز میں ظاہر ہوئے۔

مسلمانوں میں ہندوستان کے سیاسی حالات کی وجہ سے پیدا ہونے والی مایوسی کا تدارک اُس وقت ہو گیا جب ستمبر ۱۹۲۲ء میں ترک عوام اور ترک فوج نے مل کر غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں اپنی سرزمین سے غیر ملکی حملہ آوروں کو باہر نکال پھینکا اور یورپی طاقتیں بھی ترکوں کی قومی پارلیمنٹ سے مذاکرات کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ چونکہ عثمانی خلیفہ نے اپنی خوشی سے اپنا اقتدار غیر ملکی حملہ آوروں کے حوالے کیا تھا اِس لیے قومی پارلیمنٹ نے وہ اقتدار خلیفہ کو واپس کرنے کے بجائے اپنے پاس رکھا۔ پہلے خلیفہ کو صرف روحانی پیشوا بنایا گیا اور پھر ۳/مارچ ۱۹۲۴ء کو اُسے بالکل ہی معزول کر کے خلافت کا منصب فردِ واحد کے بجائے پارلیمنٹ کو منتقل کر دیا گیا۔ ہندوستان میں روائتی علمائے کرام نے اِس کے بارے میں کوئی واضح رائے ظاہر نہیں کی لیکن اقبال نے کہا، ”میری ذاتی رائے میں ترکی کا نقطۂ نظر بالکل درست ہے۔“[1]

اقبال ۱۹۰۸ء ہی سے یہ لکھتے آرہے تھے کہ تمام مسلمان ممالک کا ایک مرکزی حکومت کے ماتحت ہونا لازمی نہیں ہے بلکہ اسلام کا اصل مقصد آزاد ریاستوں کا ایک خاندان قائم کرنا ہے۔اقبال نے اِس کے لیے ”اسلامی دولتِ مشترکہ“ (Muslim

[1] Iqbal, *Reconstruction,* p.149

(Commonwealth کے الفاظ بھی استعمال کیے تھے۔[1] یہ وہی اصول تھا جو برطانوی دولتِ مشترکہ کے بارے میں بھی پہلے بیان ہو چکا ہے لیکن یہاں اس کا اطلاق مسلم دنیا پر ہو رہا تھا۔

اُس وقت تک افغانستان بھی اپنی خارجہ پالیسی کو برطانیہ کی لگائی ہوئی پابندیوں سے آزاد کروا کے مکمل خود مختاری حاصل کر چکا تھا۔ ایران میں بھی ایک فوجی افسر رضا شاہ نے (جسے اُس کے ہم نام بیٹے کے ساتھ کنفیوژ نہیں کرنا چاہیے، جو ۱۹۷۹ء کے انقلابِ ایران کے دوران معزول ہُوا)، قاچار خاندان کو معزول کر کے دستوری بادشاہت بحال کر دی اور ملک کو ترقی کی راہ پر ڈال دیا۔

جس طرح برصغیر کے مسلمانوں نے اُن اسلامی ممالک کے غم کو اپنا غم سمجھا تھا، اُسی طرح اُن کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھ کر ایک نیا حوصلہ محسوس کیا۔ اِس طرح علی برادران کی پالیسی بالآخر درست ثابت ہوئی۔ تحریکِ خلافت کے دوران یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُنہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی خاطر مسلمانوں کے قومی وجود کو مٹا دیا ہے۔ لیکن اُن اقدامات کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کو بین الاقوامی مسلم اُمت کے ساتھ جس طرح جوڑا گیا تھا، اُس کے فائدے اب دکھائی دیئے۔ مولانا محمد علی جوہر کے اپنے الفاظ میں:

دَورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اقبال نے پہلے ہی کہا تھا کہ خزاں میں شاخیں زرد ہو کر مرجھا جاتی ہیں لیکن بہار آنے پر

---

[1] Sherwani, *op.cit.,* p.141

دوبارہ زندگی بھی ہو جاتی ہیں۔ البتہ اگر کوئی شاخ خزاں کے زمانے میں درخت سے ٹوٹ جائے تو وہ بہار کے آنے پر دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتی۔ اِس لیے:

مِلّت کے ساتھ رابطۂ اُستوار رکھ
پیوستہ رہ شجَر سے، اُمیدِ بہار رکھ!

برصغیر کی مسلمان قوم خزاں میں بھی درخت سے جُڑی رہی تھی اِس لیے اُس پر بہار آگئی تھی۔ لیکن دنیائے اسلام کی اِس تازہ بہار کے علاوہ بعض دُوسرے نئے رجحانات برصغیر کے مسلمانوں کی قومی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ تھے۔

امریکی مصنفہ میری پارکر فولیٹ کی کتاب نئی ریاست (The New State)، جو ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھی، اُس زمانے کے سیاسی افکار ہلچل مچا رہی تھی۔ فولیٹ نے ایک "نئی جمہوریت" کا تصوّر پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ جمہوریت میں سیاسی جماعت کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ سیاسی جماعت کے بجائے ہر محلے کے عوام کو متفقہ رائے کے ذریعے اپنے مسائل کرنے چاہئیں اور جب اس قسم کی تنظیموں کو اتفاقِ رائے کے ساتھ فیصلے کرنے کی مشق ہو جائے تو وہ قومی سطح پر فیصلہ کرنے کے لیے ایک قومی تنظیم بن جائیں۔[1] دلچسپ بات یہ ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ بالکل اِسی طرح وجود میں آئی تھی، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ مسلم لیگ شاید انسانی تاریخ میں فولیٹ کی آئیڈیل تنظیم کی واحد مثال تھی اگرچہ فولیٹ کو اِس بات کا علم نہیں رہا ہو گا۔

فولیٹ کے نظریات کی افادیت بھی اِسی تنظیم کے ذریعے سامنے آنے والی تھی۔

---

[1] دیکھیے Follett, *The New State*

*

مسلم لیگ کی ایک بہت بڑی طاقت یہ تھی کہ مسلم معاشرے کے ادبی رجحانات اِس جماعت کے ساتھ ہم آہنگ رہے تھے۔

اِس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ہم اُن تمام مسلمانوں پر نظر ڈالیں جو ۱۹۲۶ء سے پہلے اُردو کے ادبی اُفق پر نمودار ہُوئے تو اُن میں سے زیادہ تر ہمیں کبھی نہ کبھی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے گزرتے ہوئے ضرور دکھائی دیتے ہیں، جن میں سے جوہر، اقبال اور ظفر علی خاں جیسے بڑے نام بھی کم نہیں ہیں۔

پہلی جنگ عظیم اور اُس کے بعد کے برسوں میں ادیبوں کی جو نئی کھیپ سامنے آئی، وہ بھی یا تو براہِ راست مسلم لیگ سے وابستہ تھی، ورنہ علیگڑھ یونیورسٹی، محمد علی جوہر یا علامہ اقبال کے دامن سے ضرور وابستہ تھی۔

اِس لیے ادب کے اُس باغ میں جو سر سید نے لگایا تھا، اب صحیح معنوں میں بہار آ رہی تھی۔ اور یہ بہار ایسی تھی جس میں آنے والے زمانے کے رنگ جھلک رہے تھے۔

۱۹۱۵ء سے علامہ اقبال کی شعری تصانیف مرتب ہو کر شائع ہونے لگیں اور ۱۹۲۶ء تک اسرار و رموز، پیامِ مشرق اور بانگِ درا سامنے آ چکی تھیں۔ اقبال نے فارسی ادب کی ایک درسی کتاب، آئینۂ عجم، بھی مرتب کی جو اسکولوں میں پڑھائی جانے لگی۔

۱۹۲۴ء کے لگ بھگ اُنہوں نے اپنے شاگرد حکیم احمد شجاع کے ساتھ مل کر پانچویں سے آٹھویں جماعت کے لیے اُردو کی درسی کتابیں بھی مرتب کیں۔ اُن کا نام اُردو کورس تھا۔ وہ بہت مقبول ہوئیں اور تقریباً اگلے تیس برس تک اسکولوں میں پڑھائی گئیں (کچھ عرصے پہلے اِنہیں کتابِ اُردو کے نام سے ایک نئی زندگی دینے کی کوشش کی گئی ہے، اور اپنے نئے رُوپ میں یہ سیریز ایک دفعہ پھر بعض اسکولوں میں پڑھائی جا رہی ہے)۔

نئے اُبھرنے والے شاعروں کی تعداد اگرچہ کم نہ تھی لیکن اُس زمانے میں سب سے زیادہ مقبولیت حفیظ جالندھری نے حاصل کی۔ اُن کی نظم "ابھی تو میں جوان ہُوں"، ایک نئے ابھرتے ہوئے مشرق کا ترانہ بن گئی جس میں ہر شخص اپنے دل کی ترنگ بھی سن سکتا تھا اور اپنے عہد کی آواز بھی۔ آگے چل کر یہی حفیظ جالندھری پاکستان کے قومی ترانے کے خالق بھی ہوئے۔

ادب کے نئے رجحانات آنے والے زمانے کی طرف بھی اشارہ کر رہے تھے۔ اُردو ڈرامے کو آغاحشر کاشمیری اور اُن کے بعض ہمعصر اُس زمانے تک بہت ترقی دے چکے تھے۔ اقبال کے شاگرد حکیم احمد شجاع، جنہوں نے اقبال کے ساتھ مل کر اُردو کی درسی کتابیں مرتب کی تھیں، ڈرامے کے میدان میں بھی سرگرم تھے۔ اُردو کورس میں بھی اُن کا ایک مختصر ڈرامہ، "ہوشار سراغرساں"، شامل تھا۔ آزادی کے بعد یہی حکیم احمد شجاع اور اِن کے بیٹے انور کمال پاشا کے ساتھ مل کر پاکستان کی فلمی صنعت کے بانیوں میں شمار ہُوئے۔

علیگڑھ کالج (۱۹۲۱ء سے مسلم یونیورسٹی علیگرھ) کے فزکس (طبعیات) کے شعبے کے صدر، فیروزالدین مراد نے، جو "ایف ڈی مراد" بھی کہلاتے تھے، سائنسی معلومات کو دلچسپ اور آسان میں لکھ کر عوام تک پہنچایا۔ عوام کو صحت منداور منطقی انداز میں سوچنے کا عادی بنانا بھی سرسید کا ایک مشن تھا جسے اِس طرح آگے بڑھایا جارہا تھا۔ اِسی سلسلے میں فیروزالدین مراد نے شرلک ہومز کی کہانیوں کو مصنف سر آرتھر کونن ڈائل کی باقاعدہ اجازت سے اُردو میں منتقل کیا۔

اِس طرح اُردو میں بامقصد جاسوسی ادب کی بنیاد بھی، سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے، اُسی دَور میں رکھی گئی (اور جیسا کہ ابھی ذکر ہُوا، علامہ اقبال اور حکیم احمد شجاع کے اُردو کورس میں بھی جاسوسی ڈرامہ شامل تھا)۔ آزادی کے بعد ابنِ صفی نے اِس

تحریک کو ایک حیرت انگیز نقطۂ عروج تک پہنچایا (لیکن یہ تحریک اُس قسم کے جاسوسی ادب سے مختلف تھی جس میں مجرمانہ جذبے کی تسکین اور پرورش کی جاتی ہو، جس کے اولین شاہکاروں کے طور پر ۱۹۱۶ء کے لگ بھگ شروع ہونے والے نیلی چھتری جیسے ناولوں کا سلسلہ پیش کیا جاتا ہے)۔

*

ہندو معاشرے میں جس شخص نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد سامنے آنے والے مثبت رُجحانات کی سب سے بہتر ترجمانی کی، وہ عظیم بنگالی رہنما چِت رنجن داس تھے۔ اُنہیں سی آر داس بھی کہا جاتا ہے، اور اُن کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔

گاندھی کی تحریک کی ناکامی کے بعد داس نے محسوس کیا کہ پرانی کانگرس اور لیگ کے مقابلے میں گاندھی کی بات اِس حد تک درست ضرور تھی کہ آزادی کا آخری مرحلہ کسی نہ کسی قسم کے عدم تعاون کے بغیر طے نہیں ہو سکتا۔ لیکن گاندھی نے عدم تعاون کے لیے بالکل غلط طریقہ اختیار کیا کیونکہ گلی کُوچوں میں تو وہ عدم تعاون کرواتے رہ گئے، اور اسمبلیوں میں ہندوستانیوں ہی کے منتخب کیے ہوئے نمایندے تمام نشستیں پُر کر کے حکومت کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ پھر بھلا برطانوی قوم یہ کیوں سمجھ بیٹھتی کہ ہندوستانیوں کو اُس کی حکومت قبول نہیں ہے؟ اور ہندوستان کی آزادی کا فیصلہ تو ہندوستانیوں نے انگریز حکمرانوں سے نہیں بلکہ انگریز عوام ہی سے کروانا ہے۔

اِس کے لیے داس نے ایک متبادل پروگرام پیش کیا۔ اُنہوں نے اِسے ''آزادی بذریعہ نافرمانی'' کا نام دیا، جو دسمبر ۱۹۲۲ء میں کانگرس کے اجلاس میں داس کے خطبۂ صدارت کا عنوان بن گیا۔

داس نے اُس خطبۂ صدارت میں فولیٹ کی کتاب نئی ریاست کے بارے میں کہا کہ یہ

وہی خیالات ہیں جو وہ خود بھی ۱۹۰۷ء سے ہندوستان میں پیش کرتے آئے ہیں۔[1] دُوسری طرف اقبال نے اخبارات میں اُس خطبۂ صدارت کو پڑھ کر کہا کہ اُنھوں نے خودی کو جو رُوحانی اصول پیش کیا تھا، داس نے اُسی کو "سیاسی رنگ میں پیش کیا ہے۔"[2]

اِس طرح داس کا "آزادی بذریعہ نافرمانی" کا پروگرام اُس عہد کے تین بڑے سیاسی مفکروں کے خیالات کا سنگم تھا یعنی فولیٹ، اقبال اور داس خود! آسان الفاظ میں پروگرام یہ تھا کہ عدم تعاون منتخب اسمبلیوں سے باہر سڑکوں پر نہیں بلکہ اسمبلیوں کے اندر منتخب نمایندوں کے ذریعے ہونا چاہیے۔

اگلے دوڈھائی برس میں داس نے جو اقدامات کیے اُن کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا پروگرام پانچ اقدامات پر مبنی تھا:

۱ سب سے پہلے اقلیتوں کو ضمانت دی جائے کہ آزادی کے بعد اُن کے حقوق ہر ممکن حد تک اُن کی مرضی کے مطابق طے کیے جائیں گے۔

۲ انتخاب میں صرف ایک نکتے کی بنیاد پر حصہ لیا جائے، اور وہ یہ کہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک کا آئین خود بنانے کا حق چاہیے۔

۳ پوری قوم متفق ہو کر ایک ہی جماعت کو ووٹ دے تا کہ یہ جماعت اسمبلی کی تقریباً تمام سیٹیں حاصل کر کے اسمبلی میں قوم کی واحد ترجمان بن جائے۔

۴ اسمبلی میں قوم کی واحد ترجمان کے طور پر یہ جماعت حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دے۔

۵ اِس طرح انگریز قوم پر ظاہر ہو جائے گا کہ جب تک وہ ہندوستان کو اپنی مرضی سے

---

[1] Das, *Freedom Through Disobedience,* p.45

[2] اقبال کا مکتوب بنام عبد الماجد دریابادی 6 جنوری 1923؛ برنی، کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص 418

آئین بنانے کا حق نہیں دیتے، اُس وقت تک کوئی منتخب اسمبلی کام نہیں کر سکتی۔ اُس کے بعد برطانوی پارلیمنٹ مجبور ہو گی کہ ہندوستان کو خود آئین بنانے کا حق دے دے۔

کانگرس نے داس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔[1] اُنہوں نے کانگرس کی صدارت چھوڑ دی لیکن کانگرس سے استعفا نہیں دیا اور کانگرس کے اندر ہی سَوراج پارٹی تشکیل دے دی جس میں کانگرس کے وہ رُکن شامل ہو سکتے تھے جو اسمبلیوں کے آئندہ انتخاب لڑنے پر تیار ہوں۔ وہ انتخاب ۱۹۲۳ء میں ہوئے، اور مرکزی اسمبلی میں جناح نے، جو داس کے قریبی دوست بھی تھے، داس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔

*

لیکن انتخاب سے پہلے داس نے ایک ایسا قدم اُٹھایا جس نے پورے برصغیر میں سنسنی کی لہر دوڑا دی اور ہندو معاشرے کے بعض حلقے لرز کر رہ گئے۔

دسمبر ۱۹۲۳ء میں داس نے کلکتہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سمجھوتہ کروایا جسے میثاقِ بنگال (Bengal Pact) کا نام دیا گیا۔ اُس میں نہ صرف مسلمانوں کے پرانے مطالبات تسلیم کیے گئے بلکہ بعض نئی مراعات کا اضافہ بھی کر دیا گیا۔ مثلاً یہ کہ آزاد ہندوستان میں ہندوؤں کو مساجد کے سامنے سے اپنے مذہبی جلوس گزارتے ہوئے باجا بجانے کی اجازت نہ ہو گی۔ دُوسری طرف مسلمانوں کو مذہبی تہواروں اور رسومات کے لیے گائے کی قربانی کرنے کی اجازت ہو گی لیکن وہ اُسے ہندوؤں کے سامنے یا اُن کی دلآزاری کے انداز میں نہیں کریں گے۔

[1] INC, *Report of the Thirty-Seventh Indian National Congress,* p.85
Mitra, *The Indian Annual Register, Jul-Dec 1923,* pp.217-222

اگرچہ اِسی بات نے ہندو انتہاپسندوں کو آپے سے باہر کر دیا لیکن میثاق کے دُوسرے پہلو اِس سے بھی زیادہ نتیجہ خیز تھے۔ مثلاً بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن زندگی کے ہر شعبے میں وہ ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے۔ اِس لیے میثاقِ بنگال میں طے کیا گیا کہ آزادی ملنے کے بعد تعلیم اور ملازمتوں وغیرہ میں اُنہیں اُن کی آبادی کے تناسب سے زیادہ حصے ملے گا جب تک اُن شعبوں میں اُن کی تعداد اپنی آبادی کے تناسب کے مطابق نہ ہو جائے۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنؤ میں مسلمان صرف جداگانہ انتخاب کا حق منوانے کے لیے بنگال جیسے اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں کے برابر یا اُن سے کم نشستیں لینے پر آمادگی ظاہر کر چکے تھے۔ بنگال بھی ایک ایسا ہی صوبہ تھا۔

داس کی عالی ظرفی اِس قسم کی بات کو گوارہ نہ کر سکتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا کی کوئی قوم حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہو سکتی جب تک دنیا میں ایک بھی قوم غلام ہے، اِس لیے داخلی اعتبار سے بھی ایک قوم اپنے آپ کو آزاد کہنے کی مستحق نہیں اگر اُس کا کوئی بھی طبقہ اپنے جائز حقوق سے محروم ہے۔ داس اِس اصول کی جیتی جاگتی تصویر تھے کہ حقیقی آزادی تبھی ممکن ہے جب سب قومیں اور طبقات برابر حقوق رکھتے ہوں۔

اِس لیے داس نے میثاقِ بنگال میں یہ لکھوایا کہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق بھی حاصل رہے گا اور آزادی کے بعد صوبائی اسمبلی، لوکل باڈیز اور سرکاری ملازمتوں میں بھی اُن کا حصہ ساٹھ فیصد سے کم نہ ہو گا۔[1]

میثاقِ بنگال نے ہندو انتہاپسندوں کو اِتنا مشتعل کیا کہ پنجاب میں اُن کے سب سے بڑے رہنما لالہ لاجپت رائے نے ۱۹۲۴ء میں اپنے اخباری مضامین میں لکھا کہ اگر مسلمان

Mitra, *Indian Quarterly Register, Jan-March 1924,* pp.63-64[1]

اپنے حقوق سے دستبردار نہیں ہوتے تو پنجاب اور بنگال کو تقسیم کر دیا جائے، باقی برصغیر میں بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے علیحدہ علاقے مقرر کیے جائیں، اور آبادیوں کو وہاں منتقل کر کے "ہندُو ہندوستان" اور "مسلم ہندوستان" قائم کر دیئے جائیں۔[1]

اِس کے باوجود ایک عام ہندو کی نظروں میں داس کی اہمیت گاندھی سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ بدقسمتی سے وہ اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرنے کے لیے زیادہ دن زندہ نہ رہے اور جون ۱۹۲۵ء میں فوت ہو گئے۔ جوہر نے اپنے اخبار ہمدرد میں لکھا، "داس نے جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا، اُسے کوئی شریف مسلمان نہیں بھول سکتا... خدا ہم سب کو توفیق دے کہ جس طرح وہ اپنے قرضہ سے سبکدوش ہوا ہم بھی اُس کے قرضہ سے سبکدوش ہوں۔"[2]

یہ سچ تھا کہ داس کے نمودار ہونے سے پہلے مسلمان یہ اُمید ترک کر چکے تھے کہ جہاں اُن کی اکثریت ہے، وہاں بھی جمہوری حکومت کی باگ ڈور کبھی اُن کے ہاتھوں میں آئے گی۔ اگرچہ بعض مسلمانوں کی طرف سے کہا جا رہا تھا کہ میثاقِ لکھنؤ کی اِس شِق پر دوبارہ غور کرنا چاہیے، لیکن وہ ایک اقلیتی قوم کے افراد کی دبی ادبی آوازیں تھیں۔ داس نے اکثریتی قوم کے سب سے بااثر رہنما کے طور پر مسلمانوں کے ارمان کو جس طرح زندہ کیا اُس کے گہرے نفسیاتی اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک لحاظ سے یہ میثاقِ لکھنؤ کی سب سے بڑی اور غیر متوقع ترمیم تھی، جو اِس بار اکثریتی قوم کے رہنما کی طرف سے سامنے آئی تھی۔ یہ کہنا درست ہو گا کہ آگے چل کر مسلمانوں نے جو پاکستان کا مطالبہ کیا، جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے، اُس میں اِس ترمیم کے اثرات کا دخل بھی تھا۔

اِس دوران ہندو مسلم فسادات کا بدترین دور شروع ہو چکا تھا۔ فسادات پہلے بھی ہوئے

---

[1] Lajpat Rai, *Writings and Speeches* (Volume 2), pp.212-213

[2] سید محمد شاہ قادری، مولانا محمد علی جوہر: آپ بیتی اور فکری مقالات

تھے لیکن ۱۹۲۳ء کے بعد اِتنے تواتر کے ساتھ اور اِتنے خوفناک پیمانے پر ہونے لگے کہ چند برسوں میں خانہ جنگی جیسی حالت محسوس کی جانے لگی۔

ہندو مہاسبھا کے مطابق اِس کی وجہ یہ تھی کہ میثاقِ لکھنؤ ہی کے زمانے سے مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ مسلم رہنماؤں کے مطابق فساد کی وجوہات آریہ سماج اور مہاسبھا کے اپنے رجحانات، مسلمانوں کے خلاف اُن کے اشتعال انگیز رویے، اور اُن تنظیموں کے سرکردہ رہنماؤں کی شروع کی ہوئی سنگھٹن اور شُدھی کی تحریکیں تھیں (سنگھٹن کا مقصد ہندوؤں کو لڑائی کی تربیت دینا اور شُدھی کا مقصد مسلمانوں کو دوبارہ ہندومت میں داخل کرنا تھا)۔

اِسی ماحول میں، اور داس کی وفات کے تقریباً ڈیڑھ برس بعد، نومبر ۱۹۲۶ء میں ہندوستان میں تیسری دفعہ عام انتخاب ہوئے۔ ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اقبال بھی لاہور کے شہری حلقے کے مسلمانوں کی طرف سے ایک آزاد اُمیدوار کے طور پر صوبائی اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے۔ لیکن زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۳ء کے انتخابات کے برعکس اِس دفعہ عوام نے بھرپور حصہ لیا۔ اِس طرح جداگانہ نیابت کا اُصول جو آئینی طور پر ۱۹۰۹ء سے نافذ تھا، اب عملاً بھی ایک سیاسی رواج بن گیا۔

ہندُو مہاسبھا اور دُوسرے ہندُو انتہاپسندوں نے بھی کچھ نشستیں حاصل کیں۔ اُن نشستوں کی تعداد اِتنی زیادہ نہ تھی لیکن اب ہندُو معاشرے کی فضا پر یہی لوگ چھائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے شیخ عبدالقادر نے (جنہیں آج سب سے زیادہ اس حوالے سے پہچانا جاتا ہے کہ وہ مقبول رسالے مخزن کے بانی تھے اور اقبال کی بانگِ درا کا دیباچہ اُنہی کا لکھا ہوا ہے)، اپنے خطبۂ صدارت میں بڑے افسوس کے ساتھ کہا کہ ہندو مسلم اتحاد کی وہ فضا

ختم ہو چکی ہے جو کچھ سال پہلے قائم ہوئی تھی۔ اور اب "اُس کی جگہ ایک اور مخالفانہ تحریک پیدا ہو گئی ہے جس کے حامی پنڈت مدن موہن [مالویہ] صاحب اور جناب لالہ لاجپت رائے جیسے صاحبان ہیں جو ہمیں پھر اُس فضائے سیاسی میں واپس لے جانا چاہتے ہیں جس کو ہم نے اپنی دانست میں ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا تھا۔"[1]

*

تاریخ کی ستم ظریفی تھی کہ ہندوستان کی فضا میں یہ انتشار عین اُس وقت پھیلا تھا جب ہندوستان کو متحد رہنے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ کیونکہ ہندوستان کے لیے اُس نئے آئین کے لکھے جانے کا وقت قریب آن پہنچا تھا جس کے متعلق انگریزوں نے وعدہ کر رکھا تھا کہ اُس میں ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دے دیا جائے گا۔

صرف یہی نہیں تھا بلکہ اُس برس یہ بات بھی پہلے سے زیادہ صاف ہو رہی تھی کہ ڈومینین کا مطلب واقعی ایک آزاد اور خودمختار ریاست ہوتا ہے۔ اکتوبر اور نومبر ۱۹۲۶ء میں لندن میں ساتویں امپیریل کانفرنس ہوئی، جہاں کانفرنس کے نصبُ العین کے لیے دولتِ مشترکہ ("کامن ویلتھ") کی اصطلاح باقاعدہ طور پر اَپنائی گئی، اور اُسے آزاد ریاستوں کا ایک خاندان قرار دیتے ہوئے واضح کیا گیا کہ اُس کے تمام ڈومینین آزاد، خودمختار اور برابر ہیں، اور اپنی مرضی سے "اقوام کی برطانوی دولتِ مشترکہ" (British Commonwealth of Nations) کے رُکن ہیں:

> یہ برطانوی سلطنت کے اندر خودمختار ملتیں ہیں، برابر حیثیت کی حامل، اپنے داخلی یا خارجی امور میں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کی پابندی سے آزاد، اگرچہ تاج سے مشترکہ وفاداری کے ذریعے آپس میں متحد، اور اپنی مرضی سے اقوام

---

[1] امین زبیری، سیاستِ ملیہ، ص203

دولتِ مشترکہ برطانیہ کی رکنیت کی حامل![1]

یہی وہ نصب العین تھا جس کے بیج بیس برس پہلے امپیریل کانفرنس کے آغاز پر بوئے گئے تھے، اور ہندوستان میں جس کا خواب دادابھائی نوروجی جیسے رہنماؤں نے دیکھا تھا۔ لیکن برابری کے اِس تصوّر کو برصغیر کے اندرونی اختلافات کے باوجود ایک حقیقت بنانا ہندوستانی سیاست کی اگلی آزمائش ثابت ہونے والی تھی۔

[1] Imperial Conference, *Summary of proceedings,* pp.3, 8

باب ۶

نادانیوں کا موسم

۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۶ء

۱۹۲۷ء کے آغاز پر ہندوستان میں گفتگو کا ایک اہم موضوع یہ تھا کہ صرف دو سال بعد برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان کو نیا آئین دینے والی تھی۔ اُس کے لیے ہندوستانی رہنماؤں کے مطالبات کیا ہونے چاہئیں؟

پچھلے آئین کے ترتیب دیئے جانے سے پہلے کانگرس اور لیگ نے مل کر وہ اسکیم پیش کی تھی جو میثاقِ لکھنؤ کہلائی تھی۔ نئے آئین کے لیے ایک نئی اسکیم کی ضرورت تھی لیکن اب ویسی فضا نہیں رہی تھی کہ کانگرس اور لیگ مل کر تجاویز بناتی۔

مارچ ۱۹۲۷ء میں جناح کی دعوت پر دہلی میں تقریباً چالیس مسلم رہنما اکٹھے ہوئے۔ میثاقِ لکھنؤ سے ہندوؤں کو یہ شکایت رہی تھی کہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق کیوں ملا اور مسلمانوں کو شکایت تھی کہ اُنہیں اُن کی اکثریت والے صوبوں میں بھی حکومت بنانے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ اِس لیے اِن رہنماؤں نے طے کیا کہ اگر مسلمانوں کو اپنی اکثریت والے علاقوں میں حکومت کرنے کا موقع مل جائے اور مرکزی اسمبلی میں بھی تحفظ فراہم کر دیا جائے، تو وہ جداگانہ انتخاب چھوڑ کر مخلوط انتخاب (joint electorate) قبول کر لیں گے، یعنی ہر اُمیدوار مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے ووٹوں سے منتخب ہُوا کرے گا، جیسا کہ ہندو رہنما چاہتے تھے۔

خیال تھا کہ اِس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے مطالبات پورے ہو جائیں گے لیکن ہندو مہاسبھا نے تجاویز فوراً مسترد کر دیں۔ البتہ انڈین نیشنل کانگرس نے خیر مقدم کیا، مسلم رہنماؤں کی دل کھول کر تعریف کی، اور دسمبر میں اپنے سالانہ اجلاس میں اُن تجاویز میں مذہبی رواداری کے دو نکات کا اضافہ کر کے ایک "قراردادِ اتحاد" تیار کی۔ وہ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی۔

جس طرح گیارہ برس پہلے سریندر ناتھ بینر جی نے (جو اَب فوت ہو چکے تھے)، میثاقِ لکھنؤ کو آزادی کی "ایک نئی مہم" کا آغاز کہا تھا، اُسی طرح اب کانگرس کے بعض بڑے رہنماؤں نے قراردادِ اتحاد کو آزادی کی بنیاد قرار دیا۔ "اِس قرارداد کے بغیر سوراج کی بات بھی نہیں کی جا سکتی،" شری نواس آینگر نے کہا۔ "آج برطانوی ہند کا وجود ختم ہو گیا۔ آج سے ہمیں صرف ہندوستانی دولتِ مشترکہ اور وفاقی ہندوستان کے بارے میں سوچنا ہے۔"[1]

ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے ایک نیا میثاقِ لکھنؤ وجود میں آنے والا ہے، لیکن یہ امید اگلے ہی برس ماند پڑ گئی۔ ۱۹۲۸ء میں قراردادِ اتحاد کی بنیاد پر آل پارٹیز کانفرنس بنائی گئی، جس کی ایک کمیٹی نے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ہندوستان کے آئین کا خاکہ بنا کر پیش کیا۔ یہ نہرو رپورٹ کہلایا مگر یوں لگتا تھا جیسے کسی اور ہی دنیا میں لکھا گیا ہو۔ اُس میں ہندوستان کو ڈومینین بنانے کا مطالبہ کیا گیا مگر باقی مضمون دہلی مسلم تجاویز اور قراردادِ اتحاد کے برعکس تھا۔[2]

دسمبر ۱۹۲۸ء میں تمام جماعتوں کے مشترکہ اجلاس میں مسلمان رہنماؤں نے ہندو رہنماؤں کو اصل تجاویز یاد دلانے کی کوشش کی تو ایسے ایسے جوابات ملے جن کی توقع

[1] INC, *Report of the Forty-Second Indian National Congress,* pp.91, 93

[2] دیکھیے، All Parties Conference, *Report of the Committee*

نہیں کی جاسکتی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر سے، جو چند برس پہلے کانگرس کی صدارت بھی کر چکے تھے، صاف کہا گیا، ”آپ غنڈے ہیں!“ ایک ہندو رہنما نے جناح کے بارے میں کہا کہ اِنہیں ایک بگڑا ہوا بچہ سمجھ کر بات مان لو۔ دوسرے نے جواب دیا کہ کوئی ضرورت نہیں، یہ ویسے ہی ہمارے ساتھ آجائیں گے۔[1]

اِس کے ساتھ ہی کانگرس اور مہاسبھا نے حکومت کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر ایک سال میں نہرو رپورٹ منظور نہ کی گئی تو بغاوت کر دی جائے گی۔

ہندو رہنما آخر چاہتے کیا ہیں؟ یہ سوال ایک بہت بڑا معمہ بن کر سامنے آیا کیونکہ اب ہندو رہنماؤں کا رویہ ناقابلِ فہم ہو گیا تھا۔ وہ خود ہی ایک تجویز پیش کرتے تھے اور جب مسلمان اُس تجویز کو مان لیتے تو وہ تجویز ہی تبدیل کر دی جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اگر مسلمان نہرو رپورٹ کو مان لیں تو ہندو خود ہی اُسے بھی مسترد کر کے مسلمانوں کو برا بھلا کہنے لگیں گے کہ اُنہوں نے ایسی فضول چیز کو قبول ہی کیوں کیا!

تو پھر آخر ہندو رہنما کیا چاہتے ہیں؟ مختلف مسلم رہنماؤں نے اپنی اپنی جگہ اِس سوال پر غور کیا اور سب ایک ہی جواب پر پہنچے۔

وہ جواب یہ تھا۔ ۱۹۲۶ء کے بعد سے ہندو معاشرے کی قیادت جن رہنماؤں کے ہاتھوں میں ہے، وہ حقیقت میں ہندوستان کو غلام رکھنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں خوف ہے کہ اگر انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے تو یہاں کے مسلمان دوسرے مسلم ممالک کی مدد سے دوبارہ اپنی حکومت قائم کر لیں گے، جس طرح ماضی میں کئی صدیوں تک حکومت کر چکے ہیں۔ افغانستان، ایران اور ترکی کے دوبارہ طاقتور ہو جانے کی وجہ سے ہندوؤں کے اِس اندیشے میں اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ ماضی میں عموماً اُنہی ممالک سے مسلمان حملہ آور برصغیر

---

[1] All Parties National Convention, *The Proceedings,* pp.53, 81, 87, 91

میں آئے تھے۔

مسلمان رہنما اِس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ ظاہری طور پر ہندُو رہنما انگریزوں کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کرتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ انگریزوں کو بلیک میل کر کے صرف اِس بات پر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ انگریز بدستور ہندوستان پر حکومت کرتے رہیں لیکن تمام اقلیتوں پر اونچی ذات کے ہندوؤں کی بالادستی قائم رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہندو رہنما کسی شرط پر بھی مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت نہیں کرتے کیونکہ مفاہمت ہو گئی تو برصغیر کی آزادی کا راستہ کھل جائے گا۔

سریندر ناتھ بینرجی ۱۹۱۸ء ہی میں گاندھی اور اُن کے پیروکاروں کے متعلق یہ کہہ چکے تھے کہ وہ اُن انگریزوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں جو ہندوستان کو غلام بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔[1] ۱۹۳۰ء میں اقبال نے کہا کہ یوں لگتا ہے جیسے برطانوی سامرج بھی ہندوؤں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے، ”تم مجھے ہندوستان میں قائم رکھو، اور میں بدلے میں تمہیں ایک ہندو اشرافیہ دے دوں جو باقی تمام ہندوستانی قومیتوں کو ہمیشہ کے لیے محکوم رکھے۔“[2]

مولانا محمد علی جوہر بھی اُس وقت تک یہی کہنے لگے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ مسلمانوں کا عام موٴقف بن گیا، جس کی مزید مثالیں ہم آگے دیکھیں گے۔

*

اِس دوران ۱۹۲۸ء ہی میں آئینی تجاویز تیار کرنے کے لیے انگریزوں کا ایک وفد ہندوستان آیا تھا۔ یہ سائمن کمیشن کہلایا اور کئی سیاسی جماعتوں نے اِس کا بائیکاٹ کیا تھا کیونکہ اِس

---

[1] NFL, *Report 1918*, p.41

[2]

میں کسی ہندوستانی کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ اِس مسئلے پر دو حصوں میں بٹ گئی، اور دسمبر ۱۹۲۷ء سے مارچ ۱۹۳۰ء تک جناح گروپ اور شفیع گروپ میں تقسیم رہی۔

اِن حالات میں ۳۱/ دسمبر ۱۹۲۸ء کو مسلمانوں نے دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کا افتتاح کیا (اِسے آل پارٹیز مسلم کانفرنس بھی کہا جاتا تھا)۔ یہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک قائم رہنے کے بعد مسلم لیگ میں ضم ہو گئی۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ جو نمایندے مسلم نشستوں پر منتخب ہو کر صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں پہنچیں، وہ الگ الگ جماعتوں سے تعلق رکھنے یا آزاد اُمیدوار ہونے کے باوجود ایک متفقہ مقصد کا تعین کریں۔

یہ ایک قسم کی مسلم پارلیمنٹ تھی، جس کے بانی اور پہلے صدر آغا خاں سوئم تھے۔ علامہ اقبال بھی دو سال اِس کے صدر رہے۔

افتتاحی اجلاس کے خطبۂ صدارت میں آغا خاں نے ایک نئی دلیل کے ساتھ وہ اُصول دہرایا جس پر سرسید کے زمانے سے عمل کرنے کی کوشش کی جارہی تھی:

> دورِ جدید کی تاریخ کا اہم سبق، میرے نزدیک، یہ ہے کہ صرف وہی قومیں کامیاب ہوتی ہیں اور صرف وہی پالیسیاں قوموں کی عظمت کا باعث بنتی ہیں جو چند رہنماؤں یا مفکروں کے افکار و تصورات پر مبنی نہ ہوں، خواہ وہ کتنے ہی عظیم کیوں نہ ہوں، بلکہ جو سب کے اتفاقِ رائے اور عوام کی آراء پر مبنی ہوں... وقت آ گیا ہے کہ ہمارے رہنما زمین سے کان لگا کر عوام کے خیالات اور خواہشات کا صحیح اندازہ کرنے لگیں۔

لیکن اُس خطبے کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اب تک برصغیر کے مسلمانوں کو ایک اقلیت یا زیادہ سے زیادہ ایک کمیونٹی (community) کہہ دیا جاتا تھا جس کا ترجمہ بعض لوگ فرقہ کرتے تھے اور بعض لوگ اِسے ملّت کہہ کر خوش ہو لیتے تھے۔ اگرچہ قوم کا لفظ بھی

استعمال ہو چکا تھا لیکن اُردو ہندی جیسی زبانوں میں یہ لفظ عمومی معانی میں بھی آ جاتا ہے، جیسے تاجر قوم، مرد قوم، عورت قوم وغیرہ۔ ابھی تک کسی بڑے سیاسی پلیٹ فارم سے سنجیدگی کے ساتھ یہ نہیں کہا گیا تھا کہ ہندوستانی مسلمان اُن سیاسی معانی میں ایک قوم ہیں جن معانی میں انگریز یا جرمن ایک قوم ہیں۔ یعنی ایک ایسی قوم جس کا اپنا علیحدہ وطن بھی ہوتا ہے۔ مسلم کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں آغا خاں کا خطبۂ صدارت غالباً پہلا موقع تھا کہ کسی مرکزی اہمیت کے حامل پلیٹ فارم پر کسی بڑے رہنما نے یہ بات کہی۔ اُن کے الفاظ یہ تھے کہ "ہندوستان کے مسلمان ایک کمیونٹی نہیں ہیں بلکہ ایک محدود، خصوصی، انداز میں ایک قوم ہیں جس میں بہت سی کمیونٹیز شامل ہیں اور جس کی کُل آبادی جنگِ عظیم سے پہلے کی جرمن سلطنت سے بھی زیادہ ہے۔"[1]

یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو مسلم کانفرنس نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی جس کی روح کانگرس کی قراردادِ اتحاد سے ہم آہنگ تھی لیکن مسلمانوں کے لیے بعض تحفظات کا اضافہ کیا گیا تھا۔

اقبال نے اُس قرارداد کی تائید کرتے ہوئے کہا، "اِس کی صحت کے لیے میرے پاس ایک مذہبی دلیل ہے اور وہ یہ کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت کا اجتماع کبھی گمراہی پر نہ ہو گا۔"[2]

غور کرنا چاہیے کہ اقبال کے نزدیک اس قسم کے اتفاقِ رائے کو بھی امت کا اجماع کہا جا سکتا تھا۔ جناح اُس کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے کیونکہ مسلم لیگ کے جناح گروپ کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو صرف مسلم لیگ کے سائے میں جمع ہونا چاہیے، اور جناح خود بھی

---

[1] Hafizur Rahman, *Report of the All-India Muslim Conference held at Delhi*, pp.20-22

[2] محمد رفیق افضل، گفتارِ اقبال، ص73

یہی سمجھتے تھے۔ اِس لیے جناح گروپ کے کہنے پر مارچ ۱۹۲۹ء میں جناح نے بھی مسلم مطالبات ایک قرارداد کی صورت میں مرتب کر دیئے۔ یہی قرارداد "جناح کے چَودہ نکات" کہلائی۔

ہمارے یہاں کئی مورّخین نے فرض کر لیا ہے کہ اِن نکات سے جناح کے خیالات کوئی تبدیلی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت جناح نے یہ نکات پیش کرتے ہوئے بھی حسبِ معمول یہی کہا تھا کہ "میں نے کوشش کی ہے کہ ایک ایسا ڈرافٹ پیش کروں جس میں اکثریت کی آراء شامل ہوں۔" اُنھوں نے یہ واضح کیا کہ یہ نکات اُن کے اپنے خیالات پر مبنی نہیں ہیں: "یہ تاثر موجود ہے کہ میں نے لیگ کی کونسل کے سامنے جو قرارداد پیش کی ہے [یعنی چَودہ نکات]، وہ میرے ذاتی خیالات پر مشتمل ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔"[1]

چونکہ جناح نے چَودہ نکات میں مسلمانوں کی اجتماعی رائے پیش کرنے کی کوشش کی تھی اِس لیے وہ بنیادی طور پر وہی مطالبات تھے جو مسلم کانفرنس کی اُس قرارداد میں تھے، جسے اقبال نے "اُمت کا اجتماع" قرار دیا تھا۔ چنانچہ اُس زمانے میں جناح کے چَودہ نکات اور مسلم کانفرنس کی قرارداد کئی دفعہ ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال ہوئے بلکہ اُس زمانے کے سیاسی لٹریچر میں جناح کے چَودہ نکات، مسلم کانفرنس کے چَودہ نکات اور مسلمانوں کے چَودہ نکات کے الفاظ بھی ملتے ہیں، اور جواہر لال نہرو نے تو اُنہیں "اقبال کے چَودہ نکات" بھی کہہ دیا۔

یہ مطالبات واقعی مسلمانوں کے متفقہ مطالبات بن گئے۔ تحریکِ خلافت کے زمانے میں جو مسلمان کانگرس میں شامل ہوئے تھے، اُن کی اکثریت اب اِنہیں قبول کر کے

---

[1] Mitra, *Indian Annual Register, Jan.-June 1929,* p.367

کانگرس سے الگ ہو گئی۔ جو کانگرس میں رہ گئے، وہ "نیشنلسٹ مسلمان" کہلائے۔

دُوسری طرف مسلم لیگ کے دونوں حصے پھر ایک ہو گئے۔ متحدہ لیگ کے مستقل صدر کی حیثیت میں جناح نے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے اقبال کا نام تجویز کیا۔ یہ اجلاس دسمبر ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں ہوا۔

اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلم کانفرنس کی قرارداد میں پیش کیے ہوئے مطالبات کی تائید کرتے ہوئے (جو جناح کے چَودہ نکات بھی تھے)، یہ بھی کہا:

> میں ذاتی طور پر اُن مطالبات سے بھی ایک قدم آگے جانا چاہتا ہوں جو اِس قرارداد میں پیش کئے گئے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ کم از کم ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک مربوط مسلم ریاست، خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے یا سلطنت برطانیہ کے باہر، ہندوستان کے شمالی مغربی مسلمانوں کی اٹل تقدیر ہے۔[1]

یہاں جن جملوں کے نیچے لکیر کھینچی گئی ہے، یہ خطبے کے اصل انگریزی متن میں تِرچھے خط (*italics*) میں چھَپے ہوئے تھے، گویا اقبال نے خود اِن پر خاص زور دیا تھا۔ اِنھی کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کے لیے اُس علیحدہ ریاست کا تصوّر پیش کیا جو اَب پاکستان کے نام سے موجود ہے۔

اقبال یہاں مسلم کانفرنس کی جس قرارداد کی تائید کر رہے تھے، اور جسے ایک دو برس پہلے وہ مسلمانوں کا اجماع کہہ کر اُس کی اطاعت کو "مذہبی" فریضہ قرار دے چکے تھے، اُس میں (اور جناح کے چَودہ نکات میں) یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ آیندہ آئین میں ہندوستان

[1] Sherwani, *op.cit.,* pp.10-11

ایک وفاق ہو۔ اِس لیے جب تک آئین نافذ نہیں ہُوا، اقبال نے بھی ایک متحدہ ہندوستان کی مخالفت نہیں کی اور یہی کہتے رہے کہ اُن کی مجوزہ ریاست ہندوستانی وفاق میں ایک بڑے مسلم صوبے کے طور پر قائم ہونی چاہیے۔

جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے، نیا آئین ۱۹۳۵ء میں نافذ ہُوا۔ اُس کے ساتھ ہی گویا مسلم کانفرنس کی قرارداد کی میعاد پوری ہو گئی اور مسلمانوں پر اُس کی اطاعت فرض نہیں رہی۔ اِس لیے اُس وقت اقبال نے متحدہ ہندوستان کی مخالفت شروع کی اور کہا کہ مسلم ریاست ہندوستان کے وفاق سے علیحدہ ایک خودمختار وجود کے طور پر قائم کی جائے۔ مسلم لیگ نے بھی یہی موٗقف اختیار کیا جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔

*

دسمبر ۱۹۳۰ء میں جب اقبال الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس میں خطبۂ صدارت پیش کر رہے تھے، ہندوستانی رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد لندن میں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کر رہی تھی۔

اُس کانفرنس کا اعلان وائسرائے نے ۱۹۲۹ء کے اواخر میں کیا تھا۔ مقصد ہندوستانیوں کی یہ شکایت دُور کرنا تھا کہ سائمن کمیشن میں کسی ہندوستانی کو شامل نہیں کیا گیا۔[1]

لہٰذا ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں لندن میں تین گول میز کانفرنسیں ہوئیں، جو اِس لیے اہم تھیں کہ پہلی بار ہندوستانی رہنماؤں نے براہِ راست برطانوی وزیر اعظم اور کابینہ کے ساتھ بیٹھ کر کسی آئین کی شرائط طے کیں۔ ان کانفرنسوں میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے نمایندے بھی شریک تھے۔ اُس موقع پر نہرو رپورٹ اور مسلم کانفرنس کی قرارداد کو بھی سائمن کمیشن کی تجاویز کے ساتھ رکھ دیا گیا تا کہ آیندہ آئین کا مواد تینوں

---

[1] Gwyer, *Speeches and Documents*, Vol.1, 226-227

میں سے اخذ کیا جائے۔

ایک یادگار واقعہ یہ بھی تھا کہ پہلی کانفرنس میں مولانا محمد علی جوہر نے، جو بیماری کی حالت میں تھے، اپنی تقریر میں کہا، "اگر آپ نے ہمیں ہندوستان میں آزادی نہ دی تو آپ کو مجھے یہاں ایک قبر کی جگہ دینی پڑے گی۔"[1] چند ہفتے بعد وہ سچ مچ لندن میں انتقال کر گئے۔ اُن کا سوگ پوری دنیائے اسلام میں منایا گیا اور اُنہیں فلسطینی رہنماؤں کی درخواست پر بیت المقدس میں دفن کیا گیا:

رہرو تھا راہِ عشق کا منزل کو پا لیا
اب اور کیا نشاں مری لوحِ مزار دے!
ہے رشک ایک خلق کو جوہرؔ کی موت پر
یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مولانا محمد علی جوہرؔ

اس کے علاوہ سیاسی اعتبار سے بھی گول میز کانفرنسیں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ اقبال انہیں ہندوستان کی تاریخ کے اہم ترین واقعات میں شمار کرتے تھے۔[2] البتہ کانگرس نے اِن کے متعلق بہت پینترے بدلے۔

۱۹۲۹ء کے اواخر میں جب ان کانفرنسوں کا اعلان ہُوا تو کانگرس نے یہ کہہ کر مخالفت کی کہ وہ اپنے اِس مطالبے پر قائم ہے کہ حکومت دسمبر ۱۹۲۹ء تک نہرو رپورٹ کو کسی تبدیلی کے بغیر قبول کرلے۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو لاہور میں کانگرس نے موتی لال نہرو کے صاحبزادے جواہر لال کی صدارت میں ایک قرارداد منظور کی کہ چونکہ حکومت

---

[1] IRTC, *Proceedings,* pp.89-99

[2]

نے معینہ مدت میں نہرو رپورٹ کو قبول نہیں کیا اِس لیے اب کانگرس خود اُس رپورٹ کو مسترد کرتی ہے۔ حکومت کے ساتھ مذاکرات کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ آیندہ ہندوستان کے لیے ڈومینین کا درجہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ہندوستان آزادی کے بعد دولتِ مشترکہ میں شامل ہو گا۔ بلکہ برطانیہ اور دولتِ مشترکہ سے پوری طرح علیحدہ ہو جائے گا۔

اِسے ''پُورن سَوراج'' یعنی کامل آزادی کہا جاتا تھا۔ ہر سال ۲۶/ جنوری کو ''یومِ آزادی'' منایا جانے لگا، جس میں یہ عہد دُہرایا جاتا تھا۔ ۲۶/ جنوری ۱۹۴۷ء تک یہی عہد دُہرایا گیا لیکن اُس کے بعد جب ہندوستان آزاد ہُوا تو ہندوستان چُپ چاپ دولتِ مشترکہ میں شامل ہو گیا، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں گاندھی نے پھر تحریکیں چلائیں۔ مسلمانوں نے اُن میں کوئی حصہ نہ لیا، سوائے نیشنلسٹ مسلمانوں کے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ البتہ بین الاقوامی میڈیا نے ان تحریکوں کو بہت ڈرامائی انداز میں پیش کیا اور ۱۹۳۰ء میں گاندھی کا سمندر سے نمک نکالنا ایک یادگار واقعہ بن گیا۔ لیکن دونوں تحریکیں ناکام رہیں، اور درمیانی عرصے میں گاندھی دُوسری گول میز کانفرنس میں بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔

اُس وقت تک دلیت طبقہ بھی، جو اُس زمانے میں ''اچھوت'' کہلاتا تھا، اپنے لیے جداگانہ انتخاب کا حق مانگ چکا تھا۔ یہ وہ نچلا طبقہ تھا جسے مندروں میں جانے، ہندوؤں کے کنوؤں سے پانی نکالنے اور بعض جگہوں پر کسی اونچی ذات کے ہندو کو براہِ راست مخاطب کرنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ پھر بھی ووٹوں کی گنتی میں اِن لوگوں کو ہندوؤں کے ساتھ شمار کیا جاتا تھا (اقبال نے سائمن کمیشن کے سامنے طنزاً کہا تھا کہ ہندوؤں کے لیے بعض لوگ اچھوت ہیں لیکن اُن کے ووٹ اچھوت نہیں[1])۔

[1] Indian Statutory Commission, *Report Vol. 16,* pp.131

دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی نے اچھوتوں کے مطالبے کی سخت مخالفت کی۔ لیکن سِکھوں کو چھوڑ کر جو ہندو قیادت کے ساتھ مل گئے تھے، بقیہ اقلیتیں بھی ہندوستان کی آبادی میں چھیالیس فیصد سے کم نہ تھیں۔ اُن میں مسلمان، اچھوت، عیسائی، اینگلو انڈین اور یورپین شامل تھے۔ اُن سب کے نمایندوں نے آپس میں ایک معاہدہ کیا جسے "اقلیتوں کا میثاق" (Minorities Pact) کہا گیا۔

اِس میثاق کی اہمیت یہ تھی کہ یہ مسلمانوں کی طرف سے اِس بات کا اعلان تھا کہ وہ مسلم اکثریتی صوبوں میں اپنی حکومت قائم ہونے پر وہاں اقلیتوں کو کیا حقوق دینا چاہتے ہیں۔ اور اِسی بنیاد پر وہ چاہتے ہیں کہ یہ حقوق آئین کا حصہ بنا کر پورے ہندوستان میں بھی نافذ کر دیے جائیں۔

یہ حقوق گیارہ بنیادی نکات پر مشتمل تھے، اور ہر ملّت کے خصوصی مطالبات الگ الگ بھی درج تھے۔ اُن کا خلاصہ اِس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہر مذہب کے مذہب، ثقافت اور شخصی قانون کو آئینی تحفظ دیا جائے گا۔ سرکاری عہدوں اور ملازمت جیسے معاملات میں پیدائش، ذات یا مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔ ذات پات کی بنیاد پر کسی پر کوئی پابندی لگانا قانوناً جرم ہو گی۔ مکمل مذہبی آزادی ہو گی اور ہر مذہب کے لوگوں کو اپنے اپنے عقیدے کی تبلیغ اور تعلیم کی اجازت بھی ہو گی۔ چنانچہ کسی شخص کو مذہب تبدیل کرنے پر کوئی سزا بھی نہ دی جائے گی۔

اِس میثاق میں مسلمانوں کے علاوہ اچھوتوں کو بھی اُن کی خواہش کے مطابق جداگانہ انتخاب کا حق دے دیا گیا۔ دُوسری طرف ہندوستان کے اینگلو انڈین اور یورپین افراد کے لیے اپنے مخصوص معیارِ زندگی کو برقرار رکھنے اور مقدمے کی صورت میں یورپین

جیوری طلب کرنے کے حق کو بھی تسلیم کیا گیا۔[1]

جب یہ معاہدہ برطانوی وزیرِاعظم کو پیش کیا گیا تو اینگلو انڈینوں کے نمایندے سر ہنری گڈنی نے کہا، ”میں اِس موقع پر دُوسری اقلیتوں کی طرف سے بھی اِس بات پر دِلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مسلمانوں نے اِس مشکل کاروائی کے دوران ہمارا ساتھ دیا اور رسمِ وفا نبھائی۔“[2]

لیکن اِس سے پہلے کہ یہ تمام نکات آئین کا حصہ بنتے، ۱۹۳۲ء میں گاندھی نے اچھوتوں کو دھمکی دے دی کہ اگر وہ جداگانہ انتخاب سے دستبردار نہ ہوئے تو گاندھی بھوکے رہ کر جان دے دیں گے۔ اچھوتوں کو پہلے ہی زندہ رہنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا، اب وہ گاندھی کی جان کے دشمن بھی قرار پائے۔ اچھوتوں کو کسی بہت بھیانک انجام سے بچانے کے لیے ڈاکٹر امبیدکر نے گاندھی کے سامنے سر جھکا دیا اور جداگانہ انتخاب کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے۔

مسلمانوں کے لیے آج بھی یہ معاہدہ اِس لیے اہم ہو سکتا ہے کہ نہ صرف اِس پر مسلم وفد کے سربراہ آغا خاں سوئم نے دستخط کیے بلکہ وفد کے تمام رہنما اِس سے متفق تھے۔ اُن میں جناح اور اقبال بھی شامل تھے، اور اقبال تو خاص طور پر اِس معاہدے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں مذہبی طبقے کی طرف سے بھی اِس پر اعتراض نہیں کیا گیا۔ اِس لیے یہ معاہدہ اقلیتوں کے اُن حقوق کی ایک واضح فہرست ہے جسے یہ رہنما اپنی مجوّزہ مسلم ریاست کے آئین میں شامل کرنا چاہتے تھے۔

*

۱۹۳۵ء میں ہندوستان میں نیا آئین نافذ ہوا۔ ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ نہیں دیا گیا البتہ

---

1 IRTC2, *Federal Structure Committee and Minorities Committee,* pp.550-555

2 *Ibid.*, p.540

منتخب صوبائی حکومتوں کے اختیارات میں کچھ اضافہ کر دیا گیا۔ مسلمانوں کے کچھ مطالبات تسلیم کر لیے گئے اور کچھ نظر انداز ہو گئے۔

اِس آئین کا صرف وہی حصہ نافذ کیا جا سکا جس کا تعلق صوبائی حکومتوں کے قیام سے تھا۔ مرکزی حکومت سے تعلق رکھنے والے حصے کو پہلے مسلم لیگ نے اور پھر کانگرس نے بھی مسترد کر دیا۔ چنانچہ مرکزی حکومت بدستور ۱۹۱۹ء کے آئین کے تحت ہی چلتی رہی (اور برطانوی راج کے اختتام تک کم و بیش یہی معاملہ رہا)۔

۱۹۲۰ء میں گاندھی نے جو عدم تعاون کے نام پر انتخابات کے بائیکاٹ کا تصوّر پیش کیا تھا، اُس کے حق میں اُس زمانے میں مسلم لیگ اور کانگرس نے جو قراردادیں منظور کی تھیں وہ اب تک اِن جماعتوں پر کسی نہ کسی وجہ سے مسلط رہی تھیں۔ اِس لیے، جیسا کہ پہلے ذکر ہُوا، اب تک اِن جماعتوں کے بڑے بڑے رہنماؤں نے بھی تمام انتخابات آزاد اُمیدوار کے طور پر یا کسی دُوسری جماعت کے ٹکٹ پر لڑے تھے۔

اب دونوں جماعتوں نے اُن پابندیوں سے اپنے دامن چھڑائے اور نئے آئین کے تحت ہونے والے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ یوں ہندوستان میں عام انتخابات شروع ہونے کے سولہ سترہ برس بعد دونوں بڑی جماعتیں باضابطہ طور پر اِس میدان میں اُترنے والی تھیں۔

جواہرلال نہرو نے کانگرس کی انتخابی مہم میں غریبوں کی حالت کے حوالے سے سوشلزم پر زور دیا (جس پر اِقبال نے کہا کہ جس طرح قدیم زمانے میں برہمنوں نے بدھ مت کو جذب کر کے اُس کی روح ختم کر دی، اب اُسی قسم کا معاملہ وہ سوشلزم کے ساتھ کرنے والے ہیں)۔[1]

---

[1] اقبال کا خط جناح کے نام 28 مئی 1937؛ Jinnah, *Letters of Iqbal to Jinnah,* p.19

مسلم لیگ کے لیے اپریل ۱۹۳۶ء میں بمبئی میں ہونے والا سالانہ اجلاس ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔ اسی موقع پر لیگ نے انتخاب لڑنے کا اعلان کیا اور جناح نے پورے برصغیر کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر متحد ہونے کی دعوت دی۔

*

وہ ایک عجیب لمحہ تھا۔ جس وقت بمبئی سے جناح مسلمانوں کے نام اتحاد کی دعوت جاری کر رہے تھے، اُسی وقت لاہور میں انجمن حمایتِ اسلام کے اجلاس میں اقبال اپنی تازہ نظم لے کر آئے تھے۔ بیماری کی وجہ سے اُن کی آواز بیٹھ چکی تھی اس لیے اُن کی نظم دو نوجوانوں نے ترنم سے پڑھ کر سنائی:

خودی کا سِرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فَساں لا الٰہ الا اللہ[1]

جلد ہی یہ "لا الٰہ الا اللہ"، اتحاد کی اُسی دعوت کے ساتھ منسلک ہو گیا جو مسلم لیگ کی طرف سے دی جا رہی تھی۔ چنانچہ اِس نظم کے بعض مصرعے آج تک محاوروں کی طرح مشہور ہیں۔

اقبال کے حلقے میں یہ بات کھل کر کہی جا رہی تھی کہ دَورِ حاضر میں برصغیر کے مسلمان واحد مسلمان قوم ہیں جن کی ادبیات کا تعلق "اسلام کے ماضی وحال سے بطور ایک نظامِ تمدن یا اجتماعی تحریک" کے ساتھ قائم ہیں۔ عربی، فارسی اور ترکی کا جدید ادب اِس معاملے میں بالکل فارغ ہے۔[2]

1

[2] احمد بی اے، نصیر۔ 'اُردو ادب کی اسلامی تحریک'، طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۳۵، ص۳۹-۳۲

بالکل اِسی طرح اقبال کے مکتبِ فکر نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد کے مغربی ادب کو بھی مایوسی کی پیداوار قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ بلکہ اقبال کے لحاظ سے تو مغربی علم و دانش شاید سماجی علوم کے کسی بھی شعبے میں رہنمائی فراہم کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ اُن کا اصرار تھا کہ اب اپنی اُس بصیرت پر بھروسہ کرنے کی ضرورت ہے جو سرسید کے زمانے سے اب تک قوم نے مل کر پیدا کی ہے:

دیکھے تُو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
اَفلاک منوّر ہوں ترے نورِ سحَر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا مُتَلاطم ہوں تِری موجِ گُہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہُنَر سے
اغیار کے افکار و تخیّل کی گدائی!
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی؟

دُوسری طرف وہ احساسِ کمتری بھی رنگ لا رہا تھا جو تعلیم نے مسلمانوں میں پیدا کیا تھا۔ چنانچہ ٹھیک اُسی زمانے میں، یعنی اپریل ۱۹۳۶ء میں، لکھنؤ میں کانگرس کے سالانہ اجلاس کی چھاؤں میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی بنیاد رکھی جارہی تھی، جس کے زیادہ تر رُکن مسلمان تھے۔

اُس تنظیم کے خطبۂ صدارت میں اُردو اور ہندی کے مشہور ادیب منشی پریم چند نے کہا کہ اِنسان ہمیشہ سے اخوّت اور مساوات قائم کرنے کی کوشش کرتا آیا ہے، اور "مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمدؐ سبھی نبیوں نے اخلاقی بنیادوں پر اِس مساوات کی عمارت

کھڑی کرنی چاہی مگر کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔" اِس لیے پریم چند نے کہا کہ اگر "اب بھی دھرم اور اخلاق کا دامن پکڑ کر ہم اس مساوات کی منزل پر پہنچنا چاہیں تو ہمیں ناکامی ہو گی۔" اُن کا کہنا تھا کہ "ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ ایک نئے نظام کی تکمیل کرنی ہے۔" یہ نیا نظام مغرب سے درآمد کیے ہُوئے مختلف نظریات تھے، اور ترقی سے مُراد اُس مایوسی سے بھرے ہُوئے ادب کی پیروی تھی۔[1]

*

مسلم لیگ کا انتخابی منشور جون ۱۹۳۶ء میں جاری کیا گیا۔ اِس منشور کو بنانے والے پارلیمانی بورڈ میں اقبال اور جناح کے علاوہ مولانا شوکت علی، لیاقت علی خاں اور دوسرے مسلمان رہنما شریک تھے، جن کی میٹنگ لاہور میں ہوئی۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ منشور کا ڈرافٹ اقبال ہی نے تیار کیا تھا۔[2]

اِسے مسلم لیگ کا "منشورِ عام" بھی کہا گیا۔ یہ آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے کبھی بھی پیش کیا جانے والا واحد انتخابی منشور ہے (اِس سے پہلے لیگ نے کبھی انتخاب میں حصہ ہی نہیں لیا تھا اور اِس کے بعد صرف ۱۹۴۶ء میں حصہ لیا، جس میں اُس نے کسی منشور کے بجائے صرف ایک نکاتی ایجنڈا پیش کیا، جیسا کہ ہم دیکھیں گے)۔ اِس لحاظ سے اِس منشور کی اہمیت واضح ہے۔

اِس کے علاوہ اِس میں لیگ کی سیاسی پالیسی کے کچھ ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو آج بھی اُتنے ہی اہم ہیں جتنے اُس وقت تھے۔ مثلاً اِس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں جمہوری عمل کا آغاز ہونے سے دو خود غرض گروہ مسلم معاشرے پر مسلط ہو گئے، جن کے خلاف

---

[1] قمر رئیس، سید عاشور کاظمی، ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ص ۱۷۰-۱۷۱

[2] Jinnah, *Letters of Iqbal to Jinnah,* pp.8-10

لیگ اعلانِ جنگ کر رہی تھی:

۱ پہلے گروہ کے لیے منشور کے اُردو ترجمے میں ''رجعت پسند اور ترقی کا دشمن''، اور انگریزی متن میں ''reactionary'' کے الفاظ استعمال کیے گئے۔ اِن سے مراد اونچے طبقے کے وہ لوگ تھے جنہوں نے تمام اختیارات جھپٹ لیے تھے مگر جنہیں قوم کی حالت سدھارنے اور عوام کو حقیقی آزادی دلوانے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ کچھ سال بعد جناح نے اپنی ایک مشہور تقریر میں انہی کے حوالے سے کہا، ''میں جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کو ایک تنبیہ کرنا چاہوں گا جو ہمیں نقصان پہنچا کر ایک ایسے نظام کی بدولت پنپتے رہے ہیں جو اِتنا بے رحم ہے، جو خبیث ہے، اور جو اُنہیں اتنا خود غرض بناتا ہے کہ اُنہیں کچھ سمجھانا مشکل ہے۔ عوام کا استحصال اُن کے لہو میں رچ بس گیا ہے۔ وہ اسلام کا پیغام بھول گئے ہیں۔''[1]

۲ دوسرا گروہ اُن پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل تھا جو ملازمتوں کی خاطر پہلے گروہ کے ایجنٹ بنے ہوئے تھے۔ منشور میں کہا گیا کہ ان کا ''مقصدِ وحید ہر مقام پر اور ہر ممکن طریق سے ملازمتیں اور وزارتیں حاصل کرنا'' ہے۔ جناح نے اِس رویئے کے لیے ''کیریئر ازم'' کا لفظ بھی استعمال کیا یعنی صرف ملازمت میں ترقی سے غرض رکھنا، قوم کے لیے نہ سوچنا اور نہ ہی قوم کی خاطر قربانی پر تیار ہونا۔

منشور میں کہا گیا، ''ہم پڑھے لکھے انسانوں، جاگیر داروں، اور سرمایہ داروں کا فرض ہے کہ متحد ہو کر ایک نئی معاشرت کی بنیاد رکھیں'' اور کروڑوں مسلمانوں کو ''افلاس، ذلت اور

---

[1] Yusufi, *op. cit.,* p.1720

جہالت کی اُس دلدل سے نکالیں جس میں وہ پھنسے ہوئے ہیں۔"[1]

[1] اقبال، آل انڈیا مسلم لیگ مینی فیسٹو، ص 12-8۔ کتابت کی غلطیاں درست کر دی گئی ہیں۔

باب ۷

آزادی کا راستہ

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۶ء

انتخاب ۱۹۳۷ء کے اوائل میں ہوئے۔ نتائج سے ظاہر ہُوا کہ کانگرس غیر مسلموں کی سب سے مقبول جماعت ہے لیکن مسلمانوں نے اُسے مسترد کر دیا ہے۔ دُوسری طرف مسلم لیگ پورے ہندوستان کی سطح پر مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت ثابت ہوئی لیکن اکثر صوبوں میں اُسے دُوسری مسلم جماعتوں سے شکست ہوئی۔

تفصیل کچھ یوں تھی کہ کانگرس نے گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں واضح اکثریت حاصل کی۔ لیکن ایک صوبے کے سِوا اُس کی ساری کامیابی غیر مسلم نشستوں پر تھی۔

کانگرس نے مسلم اور غیر مسلم دونوں نشستوں پر انتخاب لڑا۔ اُس وقت ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں میں مسلم نشستوں کی کُل تعداد ۴۸۲ تھی۔ کانگرس اُن میں سے صرف چھبیس نشستیں حاصل کر سکی، جن میں سے پندرہ صرف صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخواہ) سے اور بڑی حد تک عبدالغفار خاں کی وجہ سے تھیں۔ صوبہ سرحد کو چھوڑ کر پورے ہندوستان میں کانگرس کے مسلمان نمایندے صرف گیارہ تھے۔[1]

---

[1] تجزیہ بٹالوی، اقبال کے آخری دو سال، ص364 سے ماخوذ ہے۔ جدول کی تیاری میں Mitra, *Register Jan-Jun 1937*, pp.168(a)-168(o) اور Afzal, *A History*..., p.219 سے مدد لی گئی ہے۔ ماخذوں کے اعداد و شمار میں کچھ فرق کی وجہ سے ہر کالم کے اندراجات کی جمع اُس کے آخر میں دیئے ہوئے عدد کے عین مطابق ہونا ضروری

دُوسری طرف مسلم لیگ نے صرف مسلم نشستوں پر انتخاب لڑا، اور ایک سو دس نشستیں حاصل کیں جو کانگرس کی چھبیس مسلم نشستوں کے مقابلے میں چار گنا سے زیادہ تھیں۔ انتخاب کے بعد بعض دوسرے ارکان بھی لیگ کے ساتھ مل گئے تو یہ تعداد بڑھ گئی۔

ذیل میں دیے گئے اعداد و شمار ہر صوبے میں کل نشستوں، مسلم نشستوں، مسلم لیگ کی کامیابیوں، کانگرس کے مسلم امیدواروں کی کامیابیوں اور دیگر مسلم جماعتوں کی کامیابیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

	کُل	مُسلم	لیگ، مسلم	کانگرس،مسلم	کانگرس، کُل
بنگال	250	117	40	صِفر	54
پنجاب	175	84	1	2	18
سندھ	60	33	صِفر	صِفر	7
سرحد	59	36	صِفر	15	19
یُوپی	228	66	27	صِفر	134
مدراس	215	28	11	4	159
بہار	152	39	صِفر	5	98
سی پی برار	112	15	صِفر	صِفر	70
بمبئی	175	29	20	صِفر	86
آسام	108	34	10	صِفر	33
اڑیسہ	60	4	صِفر	صِفر	36
کُل	1585	482	110	26	716

ان نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم لیگ نے اگرچہ یوپی، مدراس اور بمبئی میں کانگرس سے بہتر نتائج حاصل کیے، لیکن پنجاب اور بنگال جیسے بڑے مسلم اکثریتی صوبوں میں ابھی

نہیں۔

اُسے عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے مزید محنت درکار تھی۔

*

انتخابات کے بعد مارچ ۱۹۳۷ء میں کانگرس نے دہلی میں اپنے کامیاب امیدواروں کا اجلاس بلایا جسے آل انڈیا کنونشن آف کانگرس لیجسلیٹرز کہا گیا (آل انڈیا نیشنل کنونشن بھی کہلایا)۔[1]

کانگرس کی جلسہ گاہیں ایک چھوٹے سے عارضی شہر کی صورت میں بنائی جاتی تھیں اور اِس کنونشن کے لیے اُس سے بڑھ کر اہتمام کیا گیا۔ مختلف صوبوں سے کانگرس کے آٹھ سو کامیاب اُمیدوار، کانگرس کمیٹی کے سو سو ممبر اور تقریباً دس ہزار حاضرین آئے۔ کانگرس کے صدر جواہر لال نہرو ایک جلوس کے ساتھ داخل ہوئے۔ کانگرس کے سابقہ اجلاسوں کے صدر اُن کے آگے چل رہے تھے اور فوجی بینڈ ساتھ ساتھ تھا۔ بندے ماترم قومی ترانے کے طور پر گایا گیا اور سب لوگ احتراماً کھڑے ہوئے۔ اُس کے بعد نہرو نے جو اعلان کیا وہ اِتنا بھیانک تھا کہ جب اخبارات میں آیا تو مسلمانوں میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

نہرو نے کہا، "یہ خیال فرسودہ ہو چکا ہے کہ مسلمان پہلے اپنے آپ کو منظم کریں اور پھر ہندوؤں سے ملیں،" اِس لیے آیندہ کانگرس مسلم رہنماؤں سے بات نہیں کرے گی۔

دُوسرے لفظوں میں نہ مسلم لیگ کا وجود تسلیم کیا جائے گا اور نہ ہی مسلمانوں کو ایک سیاسی وحدت مانا جائے گا۔

انتخابی مہم کے دوران بھی نہرو ایسی باتیں کہہ چکے تھے جن کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ اُن کے نزدیک ہندوستان میں صرف کانگرس اور انگریز ہی دو طاقتیں ہیں، اِس لیے جو کانگرس کے ساتھ نہیں ہے وہ انگریز کا وفادار اور ہندوستان کا غدار ہے۔ اُس وقت بھی جناح اور

[1] Mitra, *Register Jan-Jun 1937*, pp.206-213

اقبال جیسے رہنماؤں نے ان دعووں کے جواب دیئے تھے لیکن اُس وقت یہ باتیں انتخابی مہم کا حصہ سمجھ کر نظر انداز بھی کی جاسکتی تھیں۔ اب یہ واضح ہو گیا کہ جو مسلمان کانگرس کی اطاعت نہیں کرے گا اُس کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہ ہو گی۔

کنونشن میں تمام حاضرین نے ہندوستان کو آزاد کروانے اور عوام کی غربت دُور کرنے کے لیے کانگرس کی اطاعت کرنے کا حلف اٹھایا۔[1]

اخبارات میں یہ تفصیلات پڑھ کر اِقبال نے جناح کو لکھا، ''آپ کو چاہیے کہ فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن بلائیں جس میں آپ نئی صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں اور دوسرے ممتاز مسلم رہنماؤں کو بلائیں۔ اُس کنونشن میں آپ پوری وضاحت اور قوت کے ساتھ ہندوستان میں ایک جداگانہ سیاسی وحدت کے طور پر مسلمانوں کے نصبُ العین کا اعلان کر دیں۔''[2] وہ کنونشن نو برس بعد ۱۹۴۶ء میں بہت بڑے پیمانے پر منعقد ہُوا، جیسا کہ اگلے باب میں دیکھا جائے گا۔

دُوسری طرف کانگرس نے حکومت کے سامنے یہ شرط رکھی کہ آئین کے تحت صوبائی گورنروں کو جو خصوصی اختیارات دیئے گئے ہیں، وہ انہیں استعمال نہ کرنے کا وعدہ کریں۔ ورنہ کانگرس اُن صوبوں کی وزارتیں سنبھالنے سے انکار کر دے گی جہاں اُس نے کامیابی حاصل کی ہے۔

حکومت کو کانگرس کی شرط تسلیم کرنا پڑی اگرچہ یہ یقین دہانی غیر سرکاری خطوط اور وعدوں کی صورت میں تھی، قانونی طور پر ان اختیارات کو ختم نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن کانگرس نے صوبوں میں حکومتیں سنبھالنے کے بعد مسلم لیگی اُمیدواروں کو کابیناؤں میں وہ حصہ دینے سے انکار کر دیا جو آئین کے رُو سے مسلمانوں کو ملنا تھا۔ بعض صورتوں میں

---

[1] Mitra, *Jan-Jun 1937*, pp.206-213

[2] برنی، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد چہارم، ص 441

مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے اُمیدواروں سے صاف کہہ دیا گیا کہ اُنہیں وزارت صرف اُس صورت میں ملے گی اگر وہ کانگرس کی وفاداری کا حلف اٹھائیں۔
یہ اُن حقوق کی خلاف ورزی تھی جو نئے آئین کے تحت مسلمانوں کو دیئے گئے تھے۔ گورنروں کے پاس خصوصی اختیارات تھے کہ ایسی صورت میں وہ مداخلت کریں۔ لیکن کانگرس پہلے ہی وعدہ لے چکی تھی کہ وہ اختیارات استعمال نہیں کیے جائیں گے۔[1]
مسلم لیگ نے اپنے قیام سے اُس وقت تک اپنی تمام کوششیں آئین میں مسلمانوں کے لیے حقوق اور تحفظات رکھوانے کے لیے ہی کی تھیں لیکن اب وہ سب کچھ بیکار ثابت ہُوا۔ اُس زمانے کے نوجوان مسلم لیگی کارکن عاشق حسین بٹالوی نے بعد میں اُس ماحول کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے:

> سادہ، ناخواندہ اور سیاسی مسائل سے بیخبر مسلمان عوام کو یہ سمجھانا مشکل تھا کہ مخلوط یا 'کولیشن' وزارت کسے کہتے ہیں... تاہم جب عوام کو صاف، سیدھی زبان میں یہ بتایا جاتا تھا کہ کانگرس نے اُن مسلمانوں کو وزارت کی گدّی پر بٹھا دیا ہے جن کو سو میں سے نناوے مسلمان اپنا نمایندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں تو بات فوراًان کی سمجھ میں آجاتی تھی۔[2]

وہ ایک فیصلہ کن لمحہ ثابت ہُوا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ نے لکھنؤ میں سالانہ اجلاس بلایا تو مسلمانوں کی اتنی بھاری تعداد نے شرکت کی جو پہلے شاید کبھی شریک نہیں ہوئی تھی۔ وہی دن تھا جب مسلم لیگ صحیح معنوں میں ایک عوامی تحریک بن گئی۔
پنجاب اور بنگال کے بڑے رہنما جنھوں نے انتخابات میں مسلم لیگ کو شکست دی

---

[1] Yusufi, *op. cit.,* p.1149

[2] بٹالوی، اقبال کے آخری دو سال، ص464

تھی، لکھنؤ کے جلسے میں جناح کے دائیں بائیں چلتے نظر آئے، کیونکہ کانگرس نے مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ اُن کی جماعتوں کے وجود کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

یہ مناظر جناح کو قدرتی طور پر مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما کے طور پر پیش کر رہے تھے، اور اگلے برس تک اُن کے لیے ''قائداعظم'' کا لقب رائج ہو گیا۔ لیکن لکھنؤ کے جلسے میں اُنہوں نے جو خطبۂ صدارت پیش کیا، اُس میں سے بعض باتیں جنگل کی آگ کی طرح پھیلیں اور مدتوں تک ذہنوں میں گونجتی رہیں:

میں ہر مسلمان مرد، عورت اور بچے سے اِلتجا اور درخواست کرتا ہوں کہ ایک واحد پلیٹ فارم پر آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔

ایسی طاقتیں موجود ہیں جو آپ پر دھونس جمائیں گی، آپ پر جبر کریں گی اور آپ کو دھمکائیں گی۔ اور ہو سکتا ہے کہ آپ کو نقصان اُٹھانا پڑے۔

لیکن جبر کی جو آگ آپ کے خلاف بھڑکائی جا رہی ہے، صرف اُس آگ سے گزر کر ہی، اور اِن ناہمواریوں، دشواریوں اور نقصانات کی مزاحمت کر کے، اور تکلیف اُٹھا کر، اور اپنے استقلال اور وفاداری کو برقرار رکھ کر، ایک قوم اُبھرے گی جو اپنے ماضی کی شان و شوکت اور اپنی تاریخ کی اہل ہو گی۔ اور جو اپنے مستقبل کو صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں پہلے سے بھی زیادہ عظیم اور شاندار بنائے گی۔

ایک طلسماتی قوت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اپنے اہم ترین فیصلے کر لیجیے۔ وہ سنگین اور تاریخ ساز ہو سکتے ہیں جن کے اثرات دُور رَس ہوں۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچیں۔ لیکن جب ایک دفعہ فیصلہ ہو جائے تو پھر سب اُس پر فردِ واحد کی طرح قائم رہیں۔ سچے رہیں اور وفادار رہیں، اور مجھے پورا اعتماد

ہے کہ کامیابی آپ کے ساتھ ہے۔[1]

*

اُسی زمانے میں لاہور کی ایک طلبہ تنظیم نے اپیل کی کہ جنوری ۱۹۳۸ء میں "یومِ اقبال" منایا جائے۔ اُس کا تعلق اقبال کے یومِ پیدائش سے نہ تھا بلکہ صرف اقبال کے پیغام پر بات کرنے کے لیے ایک دن مقرر کر دیا گیا تھا۔

خلافِ توقع اِس اپیل پر پورے برصغیر کے مسلمانوں نے لبیک کہی۔ پنجاب سے بنگال تک تقریبات ہوئیں۔ کہیں دیہاتوں میں سیدھے سادے دہقانوں نے اپنی سمجھ کے مطابق اقبال کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہیں دیسی ریاستوں کے حکام اور ولیعہدوں نے تقریبات سے خطاب کرنے کو اپنے لیے ضروری سمجھا۔ اقبال ہمیشہ سے مسلمانوں میں مقبول تھے لیکن اب وہ "ہندُو فاشزم" کے خلاف احتجاج کی علامت بن گئے۔

کچھ مہینے بعد اپریل ۱۹۳۸ء میں وہ فوت ہوئے تو سال بھر سوگ منایا جاتا رہا:

اقبال بلند تھا ہمارا اب اور بلند ہو گیا ہے

حفیظؔ جالندھری[2]

اقبال کی وفات کے وقت کلکتہ میں مسلم لیگ کا خصوصی اجلاس ہو رہا تھا اور وہاں ہندوستان بھر کے مسلمان رہنما اکٹھے تھے۔ اِس لیے لاہور میں اقبال کی نمازِ جنازہ کے وقت کلکتہ میں پچاس ساٹھ ہزار کے مجمعے نے بھی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔[3]

شمال مغربی ہندوستان اور بنگال میں مسلمانوں کے ایک ساتھ نماز پڑھنے کے اُس منظر

---

[1]

[2] 'اقبال کی خبرِ مرگ پر'؛ حفیظ جالندھری، تلخابۂ شیریں، ص ۲۶۴

[3] Dil, 'Iqbal and the Muslim Renaissance in Bengal'

میں آنے والے دَور کی تصویر دیکھی جا سکتی تھی جب ان دونوں خطوں کے مسلمان تمام زمینی فاصلوں سے بے نیاز ہو کر ایک نیا وفاق قائم کرنے والے تھے۔

کلکتہ میں اقبال کی غائبانہ نمازِ جنازہ کے بعد وہاں ایک تعزیتی جلسہ ہُوا جس کی صدارت جناح نے کی۔ اُنہوں نے اور مولانا شوکت علی نے اپنی تعزیتی تقریروں میں کہا کہ اقبال اِس اطمینان کے ساتھ دُنیا سے رخصت ہوئے ہیں کہ اُن کا مشن مکمل ہو چکا ہے، جو مسلمانوں کو متحد کرنا تھا۔[1]

اُسی برس یعنی ۱۹۳۸ء میں دسمبر میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہُوا۔ وہاں قرارداد منظور کی گئی کہ ۱۹۳۵ء کے آئین میں تجویز کیے ہوئے وفاق کا متبادل تلاش کیا جائے۔ آئینی انداز میں اور دھیمے سُروں سے کہی گئی اِس بات کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کی ایک علیحدہ خود مختار ریاست بنانے پر غور کیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ وہیں پہلی دفعہ جناح کے لیے "قائداعظم زندہ باد" کا نعرہ بلند ہوا۔

*

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی اور ۱۹۴۵ء تک جاری رہی۔ یہ انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ تباہ کن جنگ ثابت ہوئی۔ اندازہً سات سے ساڑھے آٹھ کروڑ انسان ہلاک ہوئے جو اُس وقت کی کُل انسانی آبادی کا تین فیصد تھے۔

یہ جنگ یورپ، ایشیا، افریقہ اور بحرالکاہل میں لڑی گئی اور اِس میں ساٹھ سے زیادہ قوموں نے حصہ لیا، جو محوری (Axis) اور اتحادی (Allied) طاقتوں میں بٹی ہوئی تھیں۔

محوری طاقتوں کا مقصد ساری دنیا پر ڈکٹیٹر شپ قائم کرنا اور نسلی اصولوں کے مطابق ایک نیا نظام تشکیل دینا تھا۔ اس گروہ میں جرمنی، اٹلی، جاپان اور دنیا کے اکثر ڈکٹیٹر شامل

---

[1] ایضاً

تھے، جن میں سے ہٹلر اور مسولینی سب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ شروع میں سوویت یونین (رُوس) بھی اس گروہ میں تھا لیکن ۱۹۴۱ء میں وہ اتحادیوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔

اِن محوری طاقتوں کے مقابلے پر اتحادی قوتیں دنیا کی آزادی کا دفاع کر رہی تھیں۔ اُن میں زیادہ تر جمہوری حکومتیں اور وہ ممالک شامل تھے جن پر محوری قوتوں نے حملہ کیا تھا۔ امریکہ شروع میں جنگ سے علیحدہ رہا لیکن ۱۹۴۱ء میں وہ بھی اتحادیوں میں شامل ہو گیا۔

جنگ شروع ہوتے ہی وائسرائے نے ہندوستان کی طرف سے جنگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ اُس کے بعد ملک کے بڑے رہنماؤں سے ملاقات کی۔

مسلم لیگ نے اِس بات کی یقین دہانی چاہی کہ جنگ کے بعد کوئی بھی آئین مسلمانوں کی مرضی کے بغیر اُن پر مسلط نہیں کیا جائے گا۔ وائسرائے کا جواب تسلی بخش نہ تھا۔[1]

کانگرس نے فوری ''آزادی'' کا مطالبہ کیا۔ مطالبہ منظور نہ ہُوا تو یہ کہہ کر وزارتوں سے استعفادے دیا کہ ہندوستان کو کانگرس کی اجازت کے بغیر جنگ میں شریک کیا گیا۔[2] البتہ ہندو مہاسبھا نے یہ کہہ کر حکومت کا ساتھ دیا کہ وہ نہیں چاہتے کہ برطانوی فوج میں مسلمانوں کو ہندوؤں پر برتری حاصل ہو جائے (اِس لحاظ سے مہاسبھا کی پوزیشن ۱۹۴۱ء کے بعد کے رُوس کی پوزیشن سے مماثل تھی، جو محوری نظریے کی طرف جھکاؤ رکھنے کے باوجود سیاسی مصلحت کی وجہ سے اتحادیوں کی طرف ہو گیا)۔

قائداعظم نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ کانگرسی حکومتوں سے چھٹکارہ ملنے پر خدا کا شُکر ادا کریں اور ۲۲/ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ''یومِ نجات'' منائیں۔ بعض جگہوں پر ''یومِ نجات'' کی تقریبات میں دُوسری اقلیتیں بھی مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئیں۔

فروری ۱۹۴۰ء میں لیگ کی آئینی سب کمیٹی نے اُن اسکیموں پر غور کیا جو ''وفاق کے

---

[1] Mitra, *Indian Annual Register Jul-Dec 1939,* pp.32, 350-352

[2] *Ibid.,* p.231, 235-241

متبادل کے طور پر"، مثلاً متحدہ ہندوستان سے علیحدگی کے سلسلے میں مسلمانوں کی طرف سے سامنے آ چکی تھیں۔[1] اُس کے بعد ۲۲ / سے ۲۴ / مارچ ۱۹۴۰ء تک لاہور کے منٹو پارک میں لیگ کا ستائیسویں اجلاس ہُوا۔

اُس اجلاس میں حاضرین کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ دکھائی دیتی تھی۔ اُسی موقع پر پہلی دفعہ میاں بشیر احمد کی نظم انور قریشی نے ترنم کے ساتھ پیش کی:

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
ملت ہے جسم، جاں ہے محمد علی جناح

قائداعظم اب مسلمانوں کے لیے ایک غیر معمولی حیثیت حاصل کر چکے تھے، جیسا کہ اِس ہمیشہ زندہ رہنے والی نظم سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور اُس زمانے میں عام طور پر بھی محسوس کیا جا رہا تھا۔

اِس لیے قائداعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں خاص طور پر اِس بات پر زور دیا کہ اصل اہمیت اُن کی نہیں بلکہ مسلم لیگ کی ہے، اور عوام کو اُن پر یا کسی اور رہنما پر سہارا کرنے کے بجائے خود اپنے آپ کو منظم کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے چاہیے۔

قائداعظم نے کہا کہ اگرچہ وہ ایک طویل عرصے سے سیاست میں ہیں لیکن "وائسرائے نے کبھی میرے بارے میں نہیں بلکہ صرف اور صرف گاندھی ہی کے بارے میں سوچا تھا۔" البتہ دُوسری جنگِ عظیم شروع ہونے کے بعد وائسرائے نے مذاکرات کے لیے گاندھی کے علاوہ اُنہیں بھی بلایا:

میں نے اپنے دل میں بہت تعجب کیا کہ اچانک میری یہ ترقی کیسے ہو گئی اور پھر میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا جواب ہے، "آل انڈیا مسلم لیگ"، جس کا میں صدر

[1] Saleena Karim, *Secular Jinnah and Pakistan,* p.130

ہوں... میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمارے منظم ہونے کی افادیت، اہمیت اور معنویت کو جانیں... انسان آ سکتے ہیں اور اِنسان جا سکتے ہیں مگر لیگ ہمیشہ زندہ رہے گی۔[1]

۲۲ / اور ۲۳ / مارچ کو مسلم لیگ کی سبجکٹس کمیٹی نے اُن اصولوں کی روشنی میں جو فروری کی غور و فکر کے بعد طے کیے گئے تھے، ایک قرار تیار کی۔ اجلاس کے دوران اُسے ''آئینی قرارداد'' اور اجلاس کے بعد ''قراردادِ لاہور'' کا نام دیا گیا۔

۲۳ / مارچ کو یہ قرارداد مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے کھلے اجلاس میں پیش کی۔ بہت سے رہنماؤں کی تائید کے بعد اگلے روز متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ:

- ہندوستان کو تقسیم کر دیا جائے۔
- شمال مغربی اور شمال مشرقی خطے، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، علیحدہ ریاستیں بنا دیئے جائیں۔
- مسلم اور غیر مسلم علاقوں میں اقلیتوں کے تمام حقوق ''اُن کے ساتھ مشاورت کے ذریعے طے کیے جائیں۔''[2]

اگرچہ قرارداد میں ''پاکستان'' کا نام نہیں آیا تھا لیکن ہندُو پریس نے جلد ہی مجوزہ ریاست کو ''پاکستان'' کہنا شروع کر دیا۔ یہ لفظ پچھلے چھ سات برس میں ایک غیر متعلقہ شخص چوہدری رحمت علی کی پیش کی ہوئی ایک اسکیم کی وجہ سے کافی مشہور، اور ہندُو پریس میں کافی بدنام، ہو چکا تھا۔ اِسی مناسبت سے ہندُو پریس میں ''قراردادِ لاہور'' کو ''قراردادِ پاکستان'' کہا

---

[1] Yusufi, *op. cit.*, pp.1168

[2] دیکھیے قرارداد کا متن، Saleena Karim, *Secular Jinnah and Pakistan,* pp.367-368

جانے لگا۔

مسلم لیگ نے ”پاکستان“ اور ”قراردادِ پاکستان“ کے نام قبول کر لیے لیکن وضاحت کر دی کہ رحمت علی کا مسلم لیگ کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔[1]

اگلے برس ۲۳/مارچ کو مسلم لیگ نے ”یومِ پاکستان“ منایا اور اُس کے بعد ہر سال یہ دن منایا جانے لگا۔

*

پاکستان کا مطالبہ پیش کرنے کے بعد مسلم لیگ نے یہ موٴقف اختیار کیا کہ اگر برطانوی حکومت پاکستان کے مطالبے کو مان لے تو لیگ اس کے عملی نفاذ کے لیے جنگ کے اختتام تک انتظار کرنے پر تیار ہے اور جنگ کی کوششوں میں شریک ہو گی۔ دُوسری صورت میں وہ اُن کوششوں میں خود حصہ نہ لے گی لیکن عام مسلمانوں کو برطانیہ کی مدد کرنے سے بھی نہ روکے گی کیونکہ وہ اُصولی طور پر محوری نظریات کی مخالف ہے (”ہم نہیں چاہتے کہ نازی یہ جنگ جیتیں“)۔

۱۴/اگست ۱۹۴۰ء کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ جنگ کے بعد ہندوستان میں ایک دستورساز اسمبلی بنائی جائے گی تاکہ ہندوستانی خود اپنے ملک کا آئین بنائیں، لیکن کسی اقلیت کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف اُس آئین کو قبول کرے۔ جنگ کے دوران ہندوستانی نمایندوں کو وائسرائے کی کابینہ میں شامل کر کے اُن کے اختیارات میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

گویا وائسرائے نے صرف اِس بات کی ضمانت دی کہ جنگ کے بعد کوئی بھی آئین مسلمانوں کی مرضی کے بغیر ہندوستان پر مسلط نہیں کیا جائے گا لیکن پاکستان کے مطالبے کو

[1] Yusufi, *op. cit.,* pp.1721-1722

تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ مسلم لیگ دُوسری جنگِ عظیم میں عملاً شریک نہ ہوئی لیکن برطانیہ کی جنگی کوششوں میں کوئی رکاوٹ بھی پیدا نہ کی (اِس اعتبار سے اِس جنگ میں اُس کی پوزیشن ۱۹۴۱ء سے پہلے کے امریکہ کے ساتھ ایک مماثلت رکھتی تھی)۔

*

تعجب کی بات یہ ہے کہ اِس کے باوجود بھی برطانوی پارلیمنٹ میں اگلے سات برس کے دوران (یعنی مارچ ۱۹۴۰ء سے مارچ ۱۹۴۷ء تک) ہندوستان کے موضوع پر ہونے والی تمام بحثوں میں یہی دکھائی دیتا ہے کہ برطانیہ کی تمام سیاسی جماعتیں اور تمام آزاد اُمیدوار خواہ آپس میں کتنے ہی شدید اختلافات کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن وہ سب پاکستان کے مطالبے کی مخالفت میں یک زبان تھے۔

ہندُو رہنماؤں اور اُن کے اخبارات کی طرف سے بھی سخت ترین ردِ عمل سامنے آتا رہا، جو زیادہ تر جذباتی قسم کے اعتراضات پر مشتمل ہوتا تھا۔

قائداعظم کی طرف سے اِن تمام اعتراضات کے جو جواب محفوظ ہیں، اُن سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ "مسلمان ایک قوم ہیں۔" اِس بنیاد پر پانچ نکات تسلیم کیے جائیں تو پاکستان کی ضرورت اور اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ دراصل مسلم لیگ کے آئینی مقدمے کے پانچ بنیادی نکات ہیں، جن پر پاکستان کا مطالبہ قائم تھا:

۱ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ مختلف ریاستوں کا مجموعہ ہے جنہیں انگریزوں نے فتح کر کے اکٹھا کر دیا ہے۔

۲ سیاسی جماعتوں پر مبنی جمہوریت ویسے ہی ایک ناقص نظام ہے لیکن ہندوستان میں اِس کی وجہ سے مزید خرابی یہ پیدا ہوئی ہے کہ ایک قوم میں اکثریت حاصل کرنے والی جماعت (مثلاً کانگرس) دُوسری قوم پر حکومت

کرنے کی دعویدار بن بیٹھتی ہے (مثلاً مسلم قوم)، جس نے اُسے ووٹ بھی نہیں دیئے ہوتے۔

۳ یہی دونوں غلط تصوّرات یعنی ہندوستان کی وحدت کا مفروضہ اور سیاسی جماعتوں والی مغربی جمہوریت دوستون ہیں جو ہندوستان میں برطانوی راج کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ اِس لیے اِن دونوں ستونوں کو گرا کر مسلم لیگ پورے ہندوستان کو آزاد کروانے کی کوشش کررہی ہے، اور اُس کی جدوجہد صرف پاکستان بنانے کے لیے نہیں ہے۔

۴ کانگرس اور موجودہ ہندُو قیادت ہندوستان کی آزادی نہیں چاہتی بلکہ برطانیہ کی ماتحتی میں مسلمانوں اور دُوسری اقلیتوں پر غالب آنا چاہتی ہے۔

۵ پاکستان کا نصب ُالعین غربت اور خوف سے آزادی ہے۔

قائداعظم کے نزدیک پاکستان کے حصول کا انحصار بیرونی حالات سے زیادہ قوم کی اپنی صلاحیت، اور قوم کے اپنے ''اتحاد اور قربانی'' پر تھا۔

اِس لیے مسلم لیگ کے نقطہ ٔ نظر سے تحریکِ پاکستان کی تاریخ ترتیب دی جاتی تو حصولِ پاکستان کی جدوجہد کے مراحل انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ گفت وشنید پر مبنی نہ ہوتے، جیسا کہ عام طور پر تحریکِ پاکستان کی تاریخوں میں دکھایا جاتا ہے۔ مسلم لیگ کے اپنے نقطہ ٔ نظر سے حصولِ پاکستان کے مراحل صرف دو تھے۔

پہلے مرحلے کو قائداعظم نے وحدتِ فکرو نظر (unity of thought and ideal) اور دوسرے کو وحدتِ عمل (unity of action) کا نام دیا۔[1] علامہ اقبال نے اپنی تصنیف جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) میں انہیں وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار کے نام دے کر کہا

[1] Yusufi, *op. cit.*, pp.1800-1801

تھا، ”افکار اور کردار کی وحدت حاصل کرو تا کہ دنیا میں تمہیں حکومت مل سکے“:

وحدتِ افکار و کردار آفریں
تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں![1]

وحدتِ افکار، جسے قائداعظم وحدتِ فکر و نظر کہتے تھے، یہ تھی کہ قوم ایک مقصد پر متفق ہو جائے۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان کے ساتھ یہ مرحلہ طے ہو گیا۔

اگلا مرحلہ وحدتِ عمل تھا (جسے اقبال نے وحدتِ کردار کہا تھا)، جس سے مراد یہ تھی کہ اپنے متفقہ مطالبے کو پورا کرنے کی طاقت پیدا کی جائے۔ وہ طاقت صرف جمہوری طور پر متحد ہو جانے سے حاصل ہو سکتی تھی۔

اُس کے لیے قائداعظم نے ۱۹۴۱ء کے لگ بھگ ایک شعار (motto) پیش کیا جو فوراً ہی مشہور ہو گیا: ”ایمان، اتحاد اور نظم و ضبط“ (Faith, Unity, Discipline)۔

اگرچہ یہ شعار آج تک مشہور ہے لیکن اِس میں شامل اُصولوں کے وہ معانی بھلا دیئے گئے ہیں جو اُس وقت بتائے گئے تھے۔ حالانکہ وہی معانی اِن تین اُصولوں کو وحدتِ عمل حاصل کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اُن مخصوص معانی کے بغیر یہ الفاظ صرف دل کو بہلانے کا کام کر سکتے ہیں۔

قائداعظم کے بتائے ہوئے معانی یہ تھے:

- ایمان کی وضاحت قائداعظم نے اِس طرح کی کہ اس سے مراد خدا پر یقین، اپنی قوم پر یقین، اور اپنی قوم کی تقدیر پر یقین ہے۔[2] اِس لیے مسلم لیگ کے لٹریچر میں ایمان کے بجائے ”یقینِ محکم“ کے الفاظ بھی استعمال کیے جاتے

[1] اقبال، جاوید نامہ، ص228

[2] Yusufi, *op. cit.,* p.2688

تھے۔ اب اُس میں سے قوم پر یقین" کا تصوّر ذہنوں سے خارج کروادیا گیا ہے، جس کے بعد قوم کی تقدیر پر یقین تک بات ہی نہیں پہنچتی۔

- اتحاد سے مراد یہ تھی کہ تمام مسلمان برابر ہیں۔[1] ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے وقت قائداعظم نے مسلمانوں کے لیے یہ ہدایت بھی جاری کی کہ "نسل، برادری یاذات" کے ضمن میں صرف مسلمان لکھا جائے، مذہب صرف اسلام لکھا جائے اور فرقے کی تخصیص نہ کی جائے، اور کسی بھی زبان سے تعلق رکھنے والے مسلمان اپنی "مادری زبان" صرف اُردو لکھوائیں، لیکن جو لوگ اُردو بالکل نہیں سمجھ سکتے، وہ کوئی بھی ایسی زبان لکھ دیں جس سے وہ واقف ہوں۔[2]
- نظم و ضبط کا مطلب تھا کہ مسلم لیگ کی اطاعت کی جائے۔[3] چنانچہ پنجاب کے خضر حیات ٹوانہ، سندھ کے جی ایم سید، بنگال کے فضل الحق اور بعض دوسرے رہنما لیگ کی نافرمانی کرنے پر جماعت سے نکال دیے گئے۔ قائداعظم نے لیگ کو "ملّت کی طاقت" قرار دیا، "جس کے سامنے آپ کو ضرور جھکنا ہے خواہ آپ دنیائے اسلام کا سب سے اونچا درخت ہوں۔"[4]

یہ تین اُصول، "ایمان، اتحاد اور نظم و ضبط"، ایک طرح سے اسلامی فکر کے اُس ارتقا کا حاصل تھے جو سرسید کے زمانے سے شروع ہُوا تھا۔

اُس زمانے کے مشہور مفسر عبداللہ یوسف علی نے یہ تینوں اُصول قرآن شریف کے مطالعے میں رہنمائی کے لیے پیش کیے تھے۔ یہ یوسف علی کے انگریزی ترجمۂ قرآن کے پہلے ایڈیشن کے صفحۂ انتساب پر موجود تھے، اور قرینِ قیاس ہے کہ قائداعظم نے اِنہیں

[1] *Ibid.,* p.2688
[2] *Ibid.,* p.1309
[3] *Ibid.*, pp.1500, 2232
[4] *Ibid.,* p.1691

وہیں سے اخذ کیا ہو۔ بہر حال مطالعۂ قرآن کے یہ اُصول مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا شعار بن گئے۔

اِنہی تین اُصولوں کا کرشمہ تھا کہ ۱۹۳۷ء کے بعد سے مسلم لیگ نے مسلم نشستوں کے ضمنی انتخابات میں زیادہ تر کامیابی ہی حاصل کی تھی، جو وحدتِ عمل کی طرف ایک اہم پیشرفت تھی۔

البتہ مکمل وحدتِ عمل حاصل کرنے کے لیے دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے تک انتظار ضروری تھا۔ عام انتخابات اُس کے بعد ہی ہو سکتے تھے۔ اور اُن میں مسلم لیگ کی نتیجہ خیز کامیابی یقینی تھی۔

*

۱۵ر فروری ۱۹۴۲ء کو سنگاپور جاپانی فوج کے قبضے میں چلا گیا۔ اتحادی افواج کے تقریباً اَسّی ہزار سپاہی، جن میں برطانوی، بھارتی، آسٹریلوی اور مقامی لوگ شامل تھے، جنگی قیدی بنا لیے گئے۔ عام شہریوں کو قتلِ عام، جنسی زیادتی، جبری جسم فروشی اور دہشت و ذلّت کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ وہ مظالم تھے جو بدقسمتی سے دوسری جنگِ عظیم کے دوران جاپانی فوج کے قبضے میں جانے والے علاقوں میں عام تھے۔

اب یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ جاپانی ہندوستان کو بھی فتح کر لیں گے اور یہاں کے عوام کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔ دُوسری طرف برطانیہ اور اتحادیوں کی پوزیشن بھی کمزور تھی، اور خطرہ تھا کہ کہیں خود برطانیہ ہٹلر کے قدموں تلے نہ رَوندا جائے۔

اِن حالات میں برطانوی حکومت کے رُکن سر اسٹیفورڈ کرپس کچھ تجاویز لے کر ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ مذاکرت کرنے ہندوستان آئے۔ وہ تجاویز کانگرس کے نزدیک آزادی کے لیے ناکافی اور مسلم لیگ کے نزدیک مسلمانوں کے تحفظات کے لیے

غیر واضح تھیں، اس لیے کوئی فریق راضی نہ ہوا۔

جلد ہی گاندھی اور اُن کی جماعت نے اپنی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا جُوا کھیلا۔ اُنہوں نے انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ "ہندوستان چھوڑ دو" ("Quit India")، اور ۸/ اگست ۱۹۴۲ء کو ایک دھماکہ خیز بغاوت شروع کر دی۔

اگلی صبح انگریزوں نے گاندھی سمیت کانگرس کے سیکڑوں لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ اُس کے بعد ہزاروں کی تعداد میں کانگرس کے کارکن بھی جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔ اُن میں سے چند ایک کے سِوا باقی سب اگلے تین برس تک وہیں رہے۔ انگریزوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے، دُوسری جنگِ عظیم ختم ہونے سے پہلے اِن لوگوں کو رہا کر کے انسانیت کے مستقبل کو خطرے میں نہ ڈالا جائے گا۔

مسلمانوں نے بالکل کھل کر کہا کہ گاندھی اور کانگرس نے صرف انگریزوں کو بلیک میل کرنے کے لیے یہ گھناؤنی چال چلی ہے۔ اُن کے دعوے کچھ اور ہیں لیکن عملاً اُنہوں نے انگریزوں کو یہی پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ "ہمارے ساتھ سمجھوتہ کر لو۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان پر تمہارا راج ہو لیکن تم مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو نظر انداز کر دو۔"[1] مسلمانوں کی یہ رائے اُس زمانے میں سب کو معلوم تھی، مثلاً ۱۹۴۳ء میں برطانوی حکومتِ ہند نے اِس تحریک کے بارے میں اپنے قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر) میں بھی لکھا، "یہ رائے مسلم لیگ اور عام مسلمانوں میں خاص طور پر نمایاں ہے۔"[2]

ہندوستان سے باہر کانگرس کے ایک سابق صدر سبھاش چندر بوس ہٹلر سے ملے اور اُسے ہندوستان پر حملے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اُس کے بعد جاپانیوں کی ماتحتی

---

[1] Delhi, 30 November 1940; *ibid,* p.1281

[2] Govt. of India, *Congress Responsibility for the Disturbance 1942-43,* p.11

میں ایک ''آزاد ہند فوج'' بنائی۔ انڈیمان اور نکوبار کے جزائر، جنہیں ہندوستان میں ''کالا پانی'' کہا جاتا تھا، جاپانیوں کے قبضے میں جا چکے تھے۔ وہاں جاپانیوں نے اپنے زیرِ سایہ بوس کو ایک ''آزاد حکومتِ ہند'' بنا دی لیکن انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا اور مقامی آبادی کا قتلِ عام کرتے رہے۔ ۱۹۴۵ء میں جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد بوس مبینہ طور پر ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہو گئے اور اُن کی نام نہاد حکومت بھی اختتام کو پہنچی۔

اگرچہ اب ہندوستان میں بوس کو ''نیتاجی'' (معزز رہنما) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن اُن کی سرگرمیوں کے بارے میں بڑے بڑے اخلاقی سوالات برقرار ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ بوس آخر کس استحقاق کی بنیاد پر ایک سفاک اور بے رحم غیر ملکی طاقت کا قبضہ اپنے ملک پر کروانے کی کوشش کر رہے تھے؟ ہندوستان کی کسی بڑی سیاسی جماعت نے اُنہیں اِس کی اجازت نہیں دی تھی۔ اگرچہ اُن کی وفات کے بعد کانگرس نے اُن کے ورثے کے بعض پہلوؤں کو قبول کر لیا لیکن بوس کی زندگی میں تو اُن کے ساتھ لاتعلقی ہی ظاہر کی تھی۔

ایک ''پاکستانی'' نقطۂ نظر سے یہ معاملہ اور بھی زیادہ قابلِ اعتراض نظر آتا ہے، جیسے ایک ہندو رہنما پاکستان کے قائم ہونے سے پہلے ہی ایک غیر ملکی طاقت کی مدد سے اُس پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو (جس میں اِس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ بوس کی نام نہاد فوج میں بعض مسلمان بھی شامل تھے، جس طرح کانگرس میں کچھ نیشنلسٹ مسلمان بھی تھے)۔

لیکن سب سے بڑا سوال انسانیت کے حوالے سے اُٹھتا ہے۔ ایک لمحے کو صرف بوس کے حامیوں کی باتیں تسلیم کرتے ہوئے فرض کر لیا جائے کہ جاپانی ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد اُسے بڑی شرافت کے ساتھ بوس کے حوالے کر کے وہاں سے چلے جاتے (جس کا حقیقت کی دنیا میں ایک فیصد بھی امکان نہیں تھا)۔

تب بھی سوال اُٹھتا ہے کہ بوس اور اُن کی آزاد ہند فوج کے جیالوں نے آخر کیا سوچا تھا کہ وہ نیا ہندوستان کس قسم کی دنیا کا ایک ملک ہو گا؟

اِس بنیادی سوال کا خوفناک جواب یہ ہے کہ اُنھوں نے ایک ایسی دنیا کا تصوّر کیا تھا جہاں محوری طاقتوں کے تمام منصوبے کامیاب ہو چکے ہوں گے۔

وہ منصوبے کیا تھے؟ یہی کہ دنیا کے ایک کونے سے دُوسرے تک ہٹلر، مسولینی اور جاپان کے جنرل تُوجو جیسے آمروں کی حکومت ہو گی، بعض "کمتر" نسلوں کا وجود ختم کر دیا گیا ہو گا، کمزور قوموں کے افراد جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہوں گے اور جمہوری حکومتوں کے نشان تک مٹا دیئے گئے ہوں گے۔

محوری طاقتوں کی فتح کا مطلب ایک ایسی ہی دنیا تھی، اور بوس نے ہندوستان کی آزادی کو اُسی عالمی بندوبست کے سائے میں حاصل کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کی تھی۔

برصغیر کے المیے کی یہ تصویر اُس وقت مکمل ہوتی ہے جب ہمیں معلوم ہو کہ یہی سبھاش چندر بوس، چِت رنجن داس کے شاید سب سے زیادہ ہونہار شاگرد تھے۔ دیش بندُھو چِت رنجن داس، جنہوں نے ۱۹۲۲ء میں اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں کہا تھا، "دنیا میں کوئی بھی قوم حقیقت میں آزاد نہیں ہو سکتی جب تک دوسری قومیں غلامی میں جکڑی ہُوئی ہوں۔"[1]

تھا جو 'ناخُوب'، بتدریج وہی 'خُوب' ہُوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر[2]

1

2

*

۱۹۴۵ء کے آغاز پر صاف نظر آرہا تھا کہ اتحادی جنگ جیت جائیں گے۔

برصغیر میں کانگرس نیم جان ہو چکی تھی، اور اُس کے لیڈر اور کارکن مدّت سے جیلوں میں بند تھے۔ گاندھی کو ۱۹۴۳ء میں چھوڑ دیا گیا تھا، اور ۱۹۴۴ء میں اُنہوں نے قائداعظم کے ساتھ گفت و شنید کی تھی، جس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہُوا تھا لیکن بین الاقوامی میڈیا کی توجہ مسلم لیگ کی طرف مبذول ہونے لگی تھی۔ دُوسری طرف قائداعظم نے گزشتہ تین چار برس میں تقریباً پورے برصغیر کے دورے کیے تھے اور مسلم لیگ نے مسلمانوں کو منظم کیا تھا۔

جنوری ۱۹۴۵ء میں قائداعظم نے مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور برصغیر کے باقی لوگوں کو بھی مخاطب کرتے ہوئے کہا، ”گاندھی جی نے پچیس برس تک اپنی چلائی ہے۔ آپ مجھے دو برس دیجیے، اور میرے ساتھ آیئے۔“[1]

قائداعظم کے اِس بیان کا مطلب یہی سمجھا گیا کہ اب وہ صرف مسلمانوں کے حقوق کی بات نہیں کر رہے بلکہ پورے ہندوستان کو آزاد کروانے کے لیے اپنی رہنمائی پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ اِسی موقع پر کانگرسی رہنما سروجنی نائیڈو نے جناح کے بارے میں وہ بیان دیا تھا جو کافی مشہور ہو چکا ہے کہ ”جناح کو خریدا نہیں جا سکتا۔“[2]

کبھی گاندھی نے اپنی تحریک یہ کہہ کر شروع کی تھی کہ اگر ہندوستانی اُن کا ساتھ دیں تو وہ ایک برس میں ہندوستان کو آزاد کروا دیں گے۔ اُس کے پچیس برس بعد بھی ہندوستان غلام تھا۔ اب جناح دو برس میں ہندوستان کو آزاد کروانے کا دعویٰ کر کے اُٹھے تھے، اِس

1

2

لیے دیکھنا تھا کہ واقعی وہ دو برس میں ایسا کروانے میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں۔

۳۰ / اپریل کو ہٹلر نے خودکشی کر لی اور ایک ہفتے بعد جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اٹلی میں پہلے ہی مسولینی کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر اُسے سزائے موت دی جا چکی تھی۔ صرف جاپان میدان میں رہ گیا لیکن اب اتحادیوں کی فتح بہر صورت یقینی تھی۔

جون اور جولائی میں وائسرائے لارڈ ویول (Lord Wavell) نے شملہ میں ہندوستانی نمایندوں کے ساتھ کانفرنس کی۔ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ارکان کو بھی قید سے نکال کر کانفرنس میں بلایا گیا (لیکن کانگرس کے باقی رہنماؤں اور کارکنوں کو جنگ کے باقاعدہ اختتام سے پہلے رہا کرنے سے حکومت نے صاف انکار کر دیا)۔

وائسرائے چاہتے تھے کہ مرکز میں ایک عارضی ایگزیکٹو کونسل قائم کی جائے جو تقریباً مکمل طور پر ہندوستانیوں پر مشتمل ہو۔ حالات کے کچھ فرق کے ساتھ بنیادی طور پر وہی بات تھی جو سابقہ وائسرائے نے اگست ۱۹۴۰ء میں کہی تھی اور کانگرس نے اسے مسترد کر کے بڑی بڑی باتیں سنائی تھیں۔ اب کانگرس نے یہ پیشکش اِس طرح قبول کر لی جیسے پرانی کوئی بات یاد ہی نہ ہو۔

البتہ مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم اُسی اصول پر ڈٹے رہے جسے اُنہوں نے پہلے پیش کیا تھا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمایندہ ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ وائسرائے کی مجوزہ کونسل کے تمام مسلم ارکان مسلم لیگ ہی نامزد کرے گی۔ کانگرس کے پاس صرف غیر مسلم ارکان نامزد کرنے کا حق ہو گا۔

۱۹۳۷ء میں نہرو کی صدارت میں کانگرس نے جس طرح تمام آئینی تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ہندوستان کی واحد جماعت کہا تھا اور مسلمانوں سے تقاضا کیا تھا کہ وہ کانگرس کو ووٹ نہ دینے کے باوجود اُس کی اطاعت کریں، اُس کے بعد

مسلم لیگ کی طرف سے یہ مطالبہ جائز ہی نہیں بلکہ ضروری تھا۔ ورنہ ہندوستان ایک دفعہ پھر اُنہی اُلجھاوؤں میں اُلجھ جاتا جو پچھلے پچیس برس سے مسلسل پیدا ہو رہے تھے۔

شملہ کانفرنس ناکام رہی لیکن ہندوستان کامیاب ہو گیا۔ قائداعظم اِس پر تیار تھے کہ عام انتخابات کروا کے دیکھ لیے جائیں کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمایندہ ہے یا نہیں ہے۔ جب جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے اور ۲/ ستمبر کو دُوسری جنگِ عظیم باضابطہ طور پر ختم ہو گئی تو برصغیر میں بھی عام انتخابات کی راہ ہموار ہو گئی۔

*

جنگ کے دوران برطانیہ میں کنزرویٹو (Conservative) جماعت کی حکومت رہی تھی اور سر ونسٹن چرچل وزیراعظم تھے۔ جولائی ۱۹۴۵ء میں، جب یورپ میں جنگِ عظیم ہو چکی تھی اور صرف جاپان کے اطراف میں باقی رہ گئی تھی، برطانیہ میں نئے انتخابات ہوئے تھے۔ اُس میں لیبر (Labour) پارٹی نے فتح حاصل کی اور کلیمنٹ ایٹلی (Clement Attlee) وزیرِاعظم بنے۔

کنزرویٹو پارٹی کھل کر کہتی تھی کہ وہ ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دینے میں کوئی جلدی نہیں کرنا چاہتی۔ لیبر پارٹی ہندوستان کو آزادی کی منزل پر پہنچانے کا عزم ظاہر کرتی تھی لیکن اقبال کہہ گئے تھے کہ عملاً لیبر پارٹی سے بھی آزادی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے:

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا!
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی[1]

البتہ اِتنا فرق ضرور تھا کہ جنگ کے دوران کانگرس نے جس بے حسی کے ساتھ انگریز

1

قوم کے کمزور ترین لمحے میں اُسے "ہندوستان چھوڑ دو" کے ذریعے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی اور اِس کے لیے خود اپنے ملک کی سلامتی کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا، اُس کی وجہ سے چرچل اور اُس زمانے کے اکثر کنزرویٹو سیاستدانوں کی نظروں میں کانگرس بہت بری طرح گری تھی۔

لیکن لیبر پارٹی ایک مدّت سے ہندُو سرمایہ داروں سے فنڈز وصول کرتی چلی آ رہی تھی۔ اُس کی طرف سے کانگرس کی نازبرداری اِتنی پرانی بات تھی کہ اِس حوالے سے محمد علی جوہر بھی لیبر جماعت کے رہنماؤں طنز کر گئے تھے۔

لیبر پارٹی کا حکومت میں واپس آجانا کانگرس کے لیے ایک ایسا سہارا تھا جس کی کانگرس کو تین سال تک مفلوج رہنے کے بعد ضرورت بھی تھی۔ وہ طمطراق کے ساتھ انتخابی میدان میں اُتری اور ایک مفصل منشور جاری کیا۔

مسلم لیگ نے اِس دفعہ کسی منشور کے بجائے صرف ایک لفظ پر مشتمل ایجنڈا پیش کیا، اور وہ تھا، "پاکستان"! مسلمانوں کے لیے قائداعظم کی ہدایت یہ تھی کہ "آپ نے شخصیات کو ووٹ نہیں دینا۔ لیگ کا اُمیدوار چاہے ایک بجلی کا کھمبا ہی کیوں نہ ہو، آپ نے اُسے ووٹ دینا ہے، کیونکہ وہ پاکستان اور آپ کی قوم کی آزادی کی نمائندگی کرتا ہے۔"

انتخابی مہمات کے دوران بعض نعرے خاص طور پر مشہور ہوئے، جیسے "لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان!"، اور "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!"۔ اِن میں سے دُوسرے نعرے نے غالباً ایک نظم کے ذریعے بھی مقبولیت حاصل کی جو اُسی زمانے میں ایک نوجوان شاعر اصغر سودائی نے لکھی تھی:

شب ظلمت میں گزاری ہے   اُٹھ وقتِ بیداری ہے
جنگِ شجاعت جاری ہے   آتش و آہن سے لڑ جا

پاکستان کا مطلب کیا؟
لا الٰہ اِلّا اللّٰہ

ہادی و رہبر سرورِ دیں صاحبِ علم و عزم و یقیں
قرآں کی مانند حَسیں احمدِ مرسل صلِ علی
پاکستان کا مطلب کیا؟
لا الٰہ اِلّا اللّٰہ[1]

۱۹۴۵ء کے اواخر میں مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوا۔ اسمبلی کی کُل نشستوں میں سے ایک سو دو (۱۰۲) پر انتخاب ہُوا۔ کانگرس اُن میں سے ستاون (۵۷) حاصل کر سکی اور بعد میں ایک آزاد اُمیدوار کو ساتھ ملا کر یہ تعداد اٹھاون (۵۸) ہو گئی۔

اِس طرح مرکزی اسمبلی میں کانگرس نے اکثریت تو حاصل کر لی لیکن اُس کا یہ دعویٰ پاش پاش ہو گیا کہ وہ پورے ہندوستان کی نمایندہ ہے۔ اگرچہ اُس نے مسلمانوں، سکھوں اور یورپیوں کے لیے مخصوص نشستیں چھوڑ کر تقریباً باقی سب نشستیں جیتی تھیں، لیکن اُن کی بنیاد پر وہ صرف ہندوؤں کی واحد نمایندہ ہونے کا دعویٰ ہی کر سکتی تھی۔

مسلم نشستوں کی کُل تعداد تیس (۳۰) تھی۔ وہ تمام نشستیں مسلم لیگ نے حاصل کیں۔ نشستوں پر سو فیصد کامیابی کے علاوہ انتخاب میں ڈالے جانے والے کُل مسلم ووٹوں میں سے بھی ۸۶ء۶ فیصد مسلم لیگ کے حق میں تھے۔ لیگ کے جنرل سیکرٹری لیاقت علی خاں نے کہا، ”دنیا کی تاریخ میں کسی اور جمہوری جماعت نے ایسی کامیابی حاصل نہیں کی جیسی مسلم لیگ نے حالیہ انتخابات میں حاصل کی ہے۔“[2]

---

[1] پوری نظم میں نَو بند ہیں۔
[2] Mitra, *Indian Annual Register,* p.35

اگرچہ ابھی صوبائی اسمبلیوں کا انتخاب باقی تھے لیکن کم سے کم قائداعظم کا وہ مطالبہ بالکل جائز اور مناسب ثابت ہو گیا جو اُنھوں نے جولائی کی شملہ کانفرنس میں وائسرائے سے کیا تھا کہ ایگزیکٹو کونسل کے تمام مسلم ارکان صرف مسلم لیگ نامزد کرے گی۔ وہ کونسل تو مرکزی حکومت ہی سے تعلق رکھتی تھی۔

*

۱۹۴۶ء کے اوائل میں صوبائی اسمبلی کے انتخاب ہوئے۔

بمبئی، مدراس اور اڑیسہ کی مسلم نشستوں میں سے سو فیصد لیگ نے حاصل کیں۔ باقی صوبوں کی مسلم نشستوں میں سے صوبۂ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) کے سوا ہر جگہ اَسّی فیصد سے، اور بعض جگہ نوّے فیصد سے زیادہ حاصل کیں۔ سرحد میں پینتالیس فیصد مُسلم نشستیں ملیں۔ تفصیل یوں تھی:

اسمبلی	مسلم نشستیں	کانگرس	لیگ	لیگ، فیصد
مرکزی	30	صِفر	30	100
آسام	34		31	91
بنگال	122		116	95.8
بہار	40		34	85
بمبئی	30	صفر	30	100
سی پی برار	14		13	93
مدراس	28	صفر	28	100
سرحد	38	19	17	45

اسمبلی	مسلم نشستیں	کانگرس	لیگ	لیگ، فیصد
اڑیسہ	4	صفر	4	100
پنجاب	88		79	89.28
سِندھ	34		28	82
یُوپی	66		54	82
کُل	524	23	453	86.45

مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے ڈالے گئے مسلم ووٹوں میں سے پچھتر فیصد لیگ نے اور ساڑھے چار فیصد سے بھی کم کانگرس نے حاصل کیے۔[1]

مسلم لیگ وحدتِ عمل حاصل کر چکی تھی۔

اُس وحدتِ عمل کو ٹھوس شکل دینے کے لیے قائداعظم نے کامیاب مسلم لیگی نمایندوں کا وہ کنونشن دہلی میں بلوایا جس کی تجویز نو برس پہلے پیش کی تھی، جب اُنہوں نے مارچ ۱۹۳۷ء میں جناح کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

> آپ کو چاہیے کہ فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن بلائیں جس میں آپ نئی صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں اور دوسرے ممتاز مسلم رہنماؤں کو بلائیں۔ اُس کنونشن میں آپ پوری وضاحت اور قوت کے ساتھ ہندوستان میں ایک جداگانہ سیاسی وحدت کے طور پر مسلمانوں کے نصب اُلعین کا اعلان کر دیں۔[2]

اُس کنوشن کو اقبال کی آخری خواہش بھی سمجھا جا سکتا تھا اور وہ منزل بھی جہاں اقبال قوم کو پہنچانا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کی زندگی میں ۱۹۲۷ء سے جو مرحلہ شروع ہُوا تھا، اُس

---

1 Afzal, *A History* ..., pp.598-599

2 برنی، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد چہارم، ص 441

کی تکمیل بھی اُسی کے ساتھ ہوئی۔ لیکن کنونشن کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر اُسے ایک علیحدہ باب کی حیثیت دی جا رہی ہے، جو اِس کتاب کا اگلا باب ہے۔

باب ۸

عہدِ وفا

۱۹۴۶ء

جاگنے والے اِسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں[1]

*

یہ ایک عجیب بات تھی کہ برصغیر میں مسلمانوں نے صدیوں تک حکومت کی لیکن اُس طویل عرصے میں وہ متحد نہ ہُوئے۔

کبھی محمد بن قاسم کو مکران کے بعض مسلمانوں کے خلاف فوج کشی کرتے دیکھا گیا جو خلیفہ کے باغی تھے، اور کبھی برصغیر کی ایک مسلم ریاست دُوسری کی مخالف رہی۔ اورنگزیب نے پورے برصغیر کو متحد کیا بھی تو بڑے بڑے حصوں کو وہاں کے حکمرانوں سے جنگوں میں چھین کر!

اگر سرسید کے زمانے سے پورے برصغیر کے مسلمان متحد ہونے کی آرزو کرنے لگے یا تحریکِ خلافت جیسے لمحات میں وہ آرزو کسی حد تک پوری بھی ہوئی تو وہ ایک لُٹی پِٹی قوم کا اتحاد تھا۔ ۱۹۴۰ء سے شروع ہونے والی تحریکِ پاکستان شاید پہلا موقع تھا جب پورے

1

برصغیر کے مسلمان ایک سیاسی قوّت کے طور پر متحد ہونے کا واضح مقصد لے کر اُٹھے۔ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں وہ مقصد حاصل ہُوا۔ اور اُس انتخاب میں فتح حاصل کرنے والے مسلم لیگی نمایندے برصغیر کی پوری تاریخ میں مسلمانوں کی پہلی ایسی سیاسی وحدت تھے جس میں برصغیر کے ہر علاقے کے مسلمان اپنی رضامندی سے شریک ہوں۔ برصغیر کے مسلمانوں کی پہلی متحدہ فوج!

اگرچہ اُس فوج کے ہتھیار نیزے اور شمشیریں نہ تھے۔ بلکہ یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتحِ عالم تھے۔ ایمان، اتحاد، نظم و ضبط!

بہر حال اب وہ فوج دہلی کی طرف رواں دواں تھی۔ مسلم لیگ کے کنونشن میں شرکت کے لیے آسام سے لے کر کراچی اور پشاور سے لے کر ڈھاکہ تک نہ جانے کتنے شہروں اور گیارہ صوبوں سے منتخب نمایندے دہلی میں اکٹھے ہُوئے۔

اُن میں سے ایک نمایندے نے باقی سب کو یاد دِلا دِیا کہ یہ وہی شہر ہے جو صدیوں تک مسلمانوں کا دارُالحکومت رہا اور نہ جانے کتنے مسلمان بادشاہ اِس شہر میں بالکل اُنہی کی طرح اپنی فتح کے احساس میں سرشار، سر اُٹھا کر داخل ہُوئے۔

"دہلی بہت سی سلطنتوں کا قبرستان رہی ہے،" اُس نے کہا۔ "اور ہم یہاں اِس لیے جمع ہوئے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے متحدہ ہندوستان کے خواب کو دفنا دیں!"[1]

*

۷/ اپریل ۱۹۴۶ء کی شام دہلی کے اینگلو عربک کالج میں قائداعظم کی صدارت میں "مسلم لیگ لیجسلیٹرز کنونشن" (Muslim League Legislators' Convention)

---

[1] یہ بات سی پی کی صوبائی اسمبلی کے مسلم لیگی رکن سید رؤف شاہ نے کنونشن میں اپنی تقریر میں کہی تھی۔ میں نے اِسے کنونشن سے پہلے ہی تعارفی حصے میں شامل کرنے کا تصرّف کیا ہے۔

یعنی اسمبلیوں کے مسلم لیگی ارکان کا کنونشن شروع ہُوا۔

مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں کامیاب ہونے والے تقریباً ساڑھے چار سو مسلم لیگی نمایندوں اور تقریباً دو سو صحافیوں کے علاوہ کئی مہمان اور تماشائی بھی آئے۔

قائداعظم نے خطبہ صدارت میں کہا:

> خدا کی مہربانی اور آپ کی سر توڑ محنت سے ہم نے جو فتح حاصل کی ہے اُس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے... خدا ہمارے ساتھ ہے کیونکہ ہم درست راستے پر ہیں اور ہمارا مطالبہ اِس عظیم برصغیر میں رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے مُنصفانہ ہے... میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی طاقت یا حکومت ہمیں ہمارے پاکستان کے عزیز نصب ُالعین کو حاصل کرنے سے روک سکتی ہے۔ صرف ایک شرط ہے—اتحاد!

*

۸/اپریل کو سبجکٹس کمیٹی کی میٹنگ دن بھر ہوتی رہی جس میں ایک قرارداد تیار کی گئی۔

رات آٹھ بجے کے بعد کھلا اجلاس شروع ہُوا اور نصف شب کے بعد تک جاری رہ کر ۹/اپریل کے ابتدائی اوقات میں ختم ہُوا۔ وہاں بنگال کے مسلم لیگی رہنما حسین شہید سہروردی نے سبجکٹس کمیٹی کی تیار کی ہوئی قرارداد پیش کی۔ اُس کی تائید میں کئی مسلم لیگی نمایندوں نے تقاریر کیں۔[1]

[1] اُن کے نام یہ بتائے جاتے ہیں: چودھری خلیق الزماں (یوپی)، سر غلام حسین ہدایت اللہ (سندھ)، سر محمد سعد اللہ (آسام)، عبدالرؤف (سی پی)، نواب ممدوٹ (پنجاب)، آئی آئی چندریگر (بمبئی)، خان عبدالقیوم خاں نے (سرحد)، محمد اسماعیل (مدراس)، بیگم عزیزالنسأ رسول (یوپی)، سردار شوکت حیات خاں (پنجاب)، سر فیروز خاں نون (پنجاب)، بیگم شاہنواز (پنجاب)، لطیف الرحمٰن (بہار)، محمد یوسف (اڑیسہ)، راجہ غضنفر علی خاں

پوری قرارداد ضمیمے میں شامل ہے۔ وہاں دیکھا جا سکتا ہے کہ اِس کے سات پیراگراف ہیں جو تین موضوعات کا احاطہ کرتے تھے:

الف پہلے پانچ پیراگرافوں میں وجہ بیان کی گئی کہ برصغیر کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے مسلم اکثریتی علاقے ایک الگ، خود مختار ریاست کیوں بنائی جائیں۔ مسلمانوں کے ایک قوم ہونے کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ ہندو فلسفے کا ایک ایسا پہلو، جو ماضی میں ذات پات کے نظام کو پیدا اور قائم رکھنے کا سبب بنا، اب یہ خطرہ پیدا کر رہا ہے کہ مسلمانوں، عیسائیوں اور دیگر اقلیتوں کو سماجی اور معاشی طور پر ہمیشہ کے لیے غلام بنا دیا جائے۔

ب چھٹے پیراگراف میں ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کی بنیاد پر مطالبہ پیش کیا گیا کہ (۱) مذکورہ علاقے کو پاکستان کے نام سے ایک خود مختار ریاست بنایا جائے؛ (۲) پاکستان اور ہندوستان کے لیے الگ الگ دستور ساز اسمبلیاں بنائی جائیں؛ (۳) دونوں ریاستوں میں اقلیتوں کے تمام حقوق اُن کی مشاورت سے متعین کیے جائیں؛ اور (۴) پاکستان کے قیام کا وعدہ مزید تاخیر کے بغیر کیا جائے۔

ج آخری پیراگراف میں یقین ظاہر کیا گیا کہ اگر کسی نے متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر کوئی آئین نافذ کرنے یا مرکز میں کوئی عبوری بندوبست مسلط کرنے کی کوشش کی، جو مسلم لیگ کے مطالبے کے خلاف ہو، تو مسلمانوں کے پاس اپنی بقا اور قومی وجود کے لیے ہر ممکن مزاحمت کے سوا کوئی چارہ نہ ہو گا۔

مسلم لیگ کے منتخب ارکان نے، جن میں قائداعظم بھی شامل تھے، یہ حلف اُٹھایا کہ وہ ”پاکستان کے قومی مقصد کے حصول کے لیے مسلم لیگ کی طرف سے کسی بھی تحریک کے

(پنجاب) اور ابوالہاشم (بنگال)

سلسلے میں دیے جانے والے تمام احکام اور ہدایات کو خوشدلی اور ثابت قدمی سے پورا کریں گے۔" وہ حلف بھی ضمیمے میں شامل ہے۔

اختتامی کلمات ادا کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا کہ اب پاکستان مسلمانوں کی اکثریت کی رائے نہیں بلکہ مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ ہے، اور:

> وہ چند مسلمان جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں... ان کے وجود سے فرق نہیں پڑتا، لیکن کم سے کم اب وہ خاموش رہیں... میں اِس پلیٹ فارم سے بلاخوفِ تردید کہتا ہوں کہ مسلم ہندوستان ایک ہے اور پاکستان ہمارا مطالبہ ہے۔
>
> اب ہم یہ حلف اُٹھا چکے ہیں... پانچ سال میں ہماری قوم کو نئی زندگی مل جانا کامیابی کا ایک معجزہ ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں جیسے یہ ایک خواب ہے۔ کتنی تیزی سے قوم وہی کردار [جو انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کے اقتصادی تسلط کی وجہ سے کھو گیا تھا]، اپنی اصل شریف صورت میں دوبارہ حاصل کر رہی ہے!
>
> ہمارے مرد، ہماری عورتیں، ہمارے بچے – وہ اب مختلف طرح سوچتے، بولتے اور عمل کرتے ہیں۔[1]

حلف اخبارات کے ذریعے ہر جگہ پہنچ گیا اور ہر مسلمان سے اپیل کی گئی کہ وہ بھی وہی حلف اُٹھائے۔ وہ ایک عہد تھا جو جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے خدا کے ساتھ، ایک دوسرے کے ساتھ اور خطے کے غیر مسلموں کے ساتھ کیا۔

---

[1] Mitra, *Indian Annual Register Jan-Jun 1946*, pp.192-199

باب ۹

آزادی کی منزل

۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء

مارچ ۱۹۴۶ء میں تین برطانوی وزیر ہندوستان پہنچے اور جون کے آخر تک وہاں رہے۔ یہ وفد، جسے "کیبنٹ مشن" (Cabinet Mission) یعنی کابینہ کا وفد کہا جاتا تھا، اِس لیے آیا تھا کہ ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ مل کر ہندوستان کے آیندہ دستور کا فیصلہ کیا جائے۔ ۲۴ / مارچ سے ۲۹ / جون تک وفد نے شملہ اور دہلی میں کئی رہنماؤں سے ملاقات کی جن میں مسلم لیگ، کانگرس، سکھ اور دلت طبقات کے نمایندے شامل تھے۔

کانگرس کا مطالبہ تھا کہ ہندوستان میں ایک دستور ساز اسمبلی بنائی جائے۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ ایک کے بجائے دو اسمبلیاں بنائی جائیں، جن میں سے ایک ہندوستان کے لیے اور دُوسری پاکستان کے لیے دستور بنائے۔

پاکستان کے لیے علیحدہ دستور ساز اسمبلی کا قیام ہی دراصل پاکستان کا قیام ہوتا، جیسا کہ اُس قرارداد میں طے پایا تھا جس کا تذکرہ پچھلے باب میں ہُوا ہے۔ مسلم لیگ کے منتخب نمایندوں نے وہ قرارداد بھی کابینہ وفد کے سامنے مسلمانوں کے متفقہ مطالبے کو پیش کرنے کی غرض سے ہی لکھی تھی۔

چنانچہ وفد کے ساتھ مذاکرات کے دوران مسلم لیگ اپنے مطالبے پر قائم رہی لیکن اِس بات پر رضامند ہوگئی کہ پاکستان فوری طور پر قائم کرنے کے بجائے دس برس بعد قائم

کیا جائے۔ اِس کے بدلے میں پاکستان کو موجودہ توقعات سے ذرا زیادہ رقبہ دے دیا جائے۔

چنانچہ کابینہ مشن نے جو منصوبہ پیش (''کیبنٹ مشن پلان'') پیش کیا، اُسے آسان ترین الفاظ میں اِس طرح سمجھا جا سکتا ہے:

۱ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کم از کم دس برس تک متحدہ ہندوستان میں رہیں گے، اور اُس کے بعد اگر چاہیں تو علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ صوبائی اسمبلیوں کے ذریعے ایک دستور ساز اسمبلی منتخب کی جائے گی جو اِن شرائط کے مطابق ایک ایسا آئین تیار کرے گی جس پر ہندوستان کے تمام بڑے گروہ متفق ہوں (مثلاً کانگرس، مسلم لیگ، سکھ اور دلت وغیرہ سبھی اُسے قبول کرتے ہوں)۔

۲ وہ آئین برطانوی پارلیمنٹ سے منظور ہونے کے بعد ہندوستان میں نافذ ہو گا، جس کے بعد ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان ایک نیا معاہدہ ہو گا۔ اُسی معاہدے کے ذریعے ہندوستان کو آزادی ملے گی۔

۳ اُس وقت تک ہندوستان کا انتظام وائسرائے ایک عبوری حکومت (interim government) کی مدد سے چلائے گا، جس میں مسلم لیگ، کانگرس اور چند دیگر جماعتیں شامل ہوں گی۔ یہ عبوری حکومت فوراً تشکیل دی جا رہی ہے۔

زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ کابینہ مشن پلان نے ہندوستان کی آزادی کو یقینی نہیں بنایا تھا۔ بلکہ اِس پلان نے برطانوی حکومت کو اُس وقت تک ملک میں رہنے کا پابند کیا تھا جب تک آئین مکمل نہ ہو جائے اور برطانیہ سے معاہدہ نہ ہو جائے۔ اِن دونوں اقدامات کو ایسی شرائط سے مشروط کر دیا جن کے پورے ہونے کا بظاہر کوئی امکان دکھائی نہیں دے رہا تھا، مثلاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصفیہ اور ہم آہنگی وغیرہ۔ ہندوستان کی آزادی کے وعدے تو ۱۹۱۷ء، ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۵ء میں بھی کیے گئے تھے، ہر دفعہ یہی محسوس ہُوا

تھا جیسے بس اگلے قدم پر آزادی ملنے والی ہے، لیکن ہر دفعہ آزادی اِنہی شرائط کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے ٹل گئی تھی۔ اِس لیے کابینہ مشن پلان نے عملی طور پر ہندوستانیوں کو آزادی کے اُتنے ہی قریب رکھا جتنا کہ وہ ۱۹۱۷ء میں تھا۔

*

کابینہ مشن پلان کی تشریح پر مسلم لیگ، کانگرس اور برطانوی وفد کے درمیان اختلاف ہو گیا جو کبھی دُور نہ ہو سکا۔ مسلم لیگ نے برطانوی حکومت پر بھی الزام لگایا کہ وہ عہد شکنی اور غلط بیانی کی مرتکب ہوئی ہے۔[1]

چنانچہ ۲۷/ سے ۲۹/ جولائی تک بمبئی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہُوا، جس میں پورے برطانوی ہندوستان کے لیگی نمایندے شامل تھے۔ قائداعظم سے کہا گیا کہ وہ آئندہ لائحۂ عمل کے بارے میں مشورہ دیں۔ اُنہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ ایک نئی صورتِ حال ہے، اِس لیے اجتماعی طور پر فیصلہ کیا جائے۔ "یہ آپ کی لازمی ذمہ داری ہے کہ فیصلہ کریں ہمیں اب کیا کرنا چاہیے،" اُنہوں نے کہا۔ "کیونکہ آپ مسلم قوم کی پارلیمنٹ ہیں۔ صدر اور ورکنگ کمیٹی آپ کی بنائی ہوئی ہر پالیسی پر عمل کریں گے۔"[2] صدر سے مراد وہ خود تھے۔ یہ اُن کی طرف سے لیگ کی اطاعت کرنے کے اُس عہد کی پاسداری تھی جو اپریل میں دُوسروں کے علاوہ اُنہوں نے بھی کیا تھا۔

چنانچہ اب ایک متفقہ قرارداد منظور کی گئی کہ برطانوی حکومت نے بدعہدی کی ہے، اور کانگرس بھی اُس کے ساتھ مل کر اُونچی ذات کے ہندوؤں کا راج قائم کرنے پر تُلی ہوئی ہے، اِس لیے "وقت آ گیا ہے کہ مسلم قوم راست اقدام (direct action) کا سہارا لے"

[1] Yusufi, *op.cit.,* p.2315

[2] 28 July 1946; Ahmad, *The Nation's Voice,* Vol.5, pp.152, 154

اور ''موجودہ برطانوی غلامی اور مجوزہ ہندُو راج سے نجات حاصل کرے۔''

اِس کے بعد قائداعظم نے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ ''آج ہم نے آئینی طریقوں کو الوداع کہہ دیا ہے''، فارسی کے مشہور شاعر فردوسی کا ایک شعر یا اُس کا ترجمہ پڑھا: ''اگر آپ امن چاہتے ہیں تو ہمیں بھی جنگ نہیں چاہیے، لیکن اگر آپ جنگ چاہتے ہیں تو ہم بلا تامل اسے قبول کریں گے۔''

۱۶/اگست کا دن لیگ کی طرف سے ''یومِ راست اقدام'' (Direct Action Day) کے طور پر منتخب کیا گیا۔ یہ کسی براہِ راست اقدام کے آغاز کے لیے نہ تھا، کیونکہ اس کی تفصیلات لیگ نے ابھی طے کرنی تھیں۔ یومِ راست اقدام کا مقصد مسلم عوام کو ''راست اقدام'' کا مطلب سمجھانا اور اُنہیں لیگ کی تازہ ترین پوزیشن سے آگاہ کرنا تھا۔

یہ دن ہندوستان کے اکثر حصوں میں پُرامن گزرا لیکن کلکتہ میں ایک ہولناک فساد شروع ہو گیا جو ماضی میں ہونے والے ہندُو مسلم فسادات سے زیادہ تباہ کن تھا۔ آہستہ آہستہ دُوسرے کئی علاقوں میں بھی بدترین فسادات رونما ہونے لگے۔ صرف ہلاک ہونے والوں کی تعداد ہی چالیس پچاس ہزار کے قریب پہنچنے لگی۔ دُوسرے دل دہلا دینے والے مظالم ان کے علاوہ تھے۔

جناح نے اِن فسادات کی واضح الفاظ میں مذمت کی اور کہا کہ کوئی بھی مسلمان جو تشدد کرے گا، وہ ''محض مسلم لیگ کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کرے گا'' اور ''اُسے قانون کے مطابق سزا دی جانی چاہیے۔''[1]

دوسری طرف برطانوی حکومت نے کابینہ مشن پلان کے مطابق ایک عبوری حکومت بنائی اور دستور ساز اسمبلی بھی تشکیل دے دی۔

---

[1] 18 August 1946; *ibid,* p.215

مسلم لیگ چونکہ پارلیمانی طریقے کو چھوڑ کر راست اقدام کی حکمتِ عملی کے حق میں قرارداد منظور کر چکی تھی، اِس لیے اُس نے پہلے تو عبوری حکومت میں شریک ہونے سے انکار کیا۔ جب بعض حالات کی وجہ سے شامل ہونا پڑا تو اپنے حصے کی نشستوں پر لیاقت علی خاں، عبدالرب نشتر، آئی آئی چندریگر اور غضنفر علی خاں کے علاوہ دلِت رہنما جوگندر ناتھ منڈل کو بھی نامزد کر دیا (کانگرس نے بھی ایک دلِت کو نامزد کیا تھا لیکن دباؤ میں آنے کے بعد اور پھر وہ دلِت ایک پکا کانگرسی تھا)۔

البتہ مسلم لیگ دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونے پر کسی طرح راضی نہ ہُوئی۔ اُس کا یہی انکار ہندوستان کی تقدیر بدل گیا۔ لیکن اُسے سمجھنے کے لیے بعض ایسی غلط فہمیوں کو دُور کرنا ضروری ہے جو برصغیر کی آزادی کے حوالے سے عام ہو چکی ہیں۔

*

عام طور پر برصغیر کی آزادی اور انگریزوں کے یہاں سے رخصت ہونے کی یہ وجوہات بتائی جاتی ہیں:

۱ دُوسری جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ اقتصادی، فوجی یا کسی اور وجہ سے اِس قابل نہ رہا کہ وہ برصغیر پر حکومت کر سکے۔ امریکہ اور رُوس بھی اُس پر ہندوستان کی آزادی کے لیے دباؤ ڈال رہے تھے۔

۲ گاندھی اور کانگرس کی تحریکوں نے انگریزوں کو جانے پر مجبور کر دیا۔

۳ سبھاش چندبورس کی جدوجہد، جس کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے، رنگ لائی۔ ورنہ برطانوی ہند کی نیوی میں بعض ہندوستانیوں کی بغاوت نے، جو ۱۹۴۶ء کے آغاز میں ہُوئی، انگریزوں کو ڈرا دیا ہو گا۔

۴ ہندو مسلم فسادات، بالخصوص اگست ۱۹۴۶ء میں کلکتہ کی خونریزی سے شروع

ہونے والی نئی لہر، نے حالات اِتنے خراب کر دیئے کہ انگریزوں کو جانا ہی پڑا۔

۵ لیبر پارٹی نے ۱۹۴۵ء میں اپنے انتخابی منشور میں ہندوستان کو خود مختاری دِلوانا بھی اپنی ترجیحات میں شامل کیا تھا۔

یہ دیکھنا مشکل نہیں ہے کہ اِن میں سے دُوسری وجہ یعنی گاندھی اور کانگرس کی تحریکوں کے علاوہ باقی تمام وجوہات ایسی ہیں جنہیں دومنٹ کے لیے تسلیم کرنے کا بھی کوئی جواز سِرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

کیونکہ اِن میں سے ہر ایک اِس حقیقت کو نظر انداز کر کے پیش کی گئی ہے کہ اِن تمام واقعات کے باوجود جولائی ۱۹۴۶ء میں، کابینہ مشن پلان کے ذریعے، برطانیہ ہندوستان پر اپنی حکومت کو ایک غیر معینہ مدّت تک جاری رکھنے پر تیار ہو گیا تھا۔ اور اگست ۱۹۴۶ء میں ملک کے حالات بگڑنے کے بعد بھی برطانیہ اپنے منصوبے کے مطابق دستور ساز اسمبلی تشکیل دے رہا تھا (اُس اسمبلی کا افتتاح دسمبر ۱۹۴۶ء میں ہُوا، جس کا ذکر آگے آنے والا ہے)۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء کے اختتام تک خود کانگرس میں یہ کہنے والے موجود تھے کہ برطانوی حکومت ابھی تک گول مول بات کر رہی ہے، اور سنہ ۱۹۴۶ء ایک سوالیہ نشان پر ختم ہوا ہے۔[1]

اب لے دے کر صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کیا گاندھی اور اُن کی کانگرس نے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا؟

حقیقت یہ ہے کہ گاندھی نے ہر دفعہ ملک گیر تحریک شروع کرتے ہوئے زبان سے جو مطالبہ کیا عملی نتیجہ اُس کے برعکس نکلا۔ عموماً انگریز تحریک شروع ہونے سے پہلے جتنا دینے پر تیار تھے، گاندھی کی تحریک کے بعد اُس سے کم دے کر چھوٹ گئے:

---

[1] Mitra, *Indian Annual Register Jul-Dec 1946,* pp.94, 96

نتیجہ	کاروائی	سال
اگلا آئین سولہ سال بعد (1935 میں) بنا۔ سوراج نہیں ملا۔	حکومت کا وعدہ تھا کہ دس سال بعد (1929 میں) نیا آئین دیا جائے گا جس میں ہندوستان کے لیے مزید اختیارات ہوں گے۔ گاندھی کا مطالبہ تھا کہ ایک سال میں سوراج دیا جائے۔	1920-22
گول میز کانفرنس ہوئی جس میں گاندھی نے بھی شرکت کی۔ اگلے آئین میں (جو 1935 میں نافذ ہوا) نہ ہندوستان کو آزادی ملی نہ ڈومینین اسٹیٹس۔ کانگرس نے اسی آئین کے تحت وزارتیں قبول کیں۔	وائسرائے کی پیشکش تھی کہ گول میز کانفرنس آیندہ آئین کے لیے تجاویز مرتب کرکے برطانوی پارلیمنٹ کو پیش کرے۔ گاندھی کا مطالبہ تھا کہ ہندوستان کو فوراً آزادی ملے اور وہ دولتِ مشترکہ میں بھی شامل نہ رہے۔	1930-31
نتیجہ اوپر درج کیا جاچکا ہے۔	وائسرائے اپنی مندرجہ بالا پیشکش پر قائم تھے۔ گاندھی نے مندرجہ بالا مطالبہ دہرایا۔	1932
جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی منتخب ہوئی اور کانگرس نے	برطانوی حکومت کی پیشکش تھی کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی اپنی	1942-45

سال	کاروائی	نتیجہ
	مرضی کا آئین بنائے۔ جنگ کے دوران دفاع کا شعبہ برطانیہ کے کنٹرول میں رہے لیکن بعض دوسرے شعبے ہندوستانیوں کے سپرد کیے جاسکتے ہیں۔ کانگرس نے مطالبہ کیا کہ برطانیہ فوری طور پر ہندوستان چھوڑ دے۔	بخوشی اس میں شرکت کی۔ جنگ کے دوران بھی مرکزی حکومت کے سبھی شعبے انگریزی کنٹرول میں رہے۔

چنانچہ سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ ۱۹۴۶ء میں بھی کانگرس اپنے منہ سے جو دستور ساز اسمبلی مانگ رہی تھی، اور جس عبوری حکومت میں شریک ہونے پر خوشی کا اظہار کر رہی تھی، وہ دونوں چیزیں وہی تھیں جو چار سال پہلے انگریزوں نے تھال میں رکھ کر پیش کی تھیں، اور کانگرس نے خاص اِنہی دونوں چیزوں کو مسترد کرنے کے مقصد سے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک چلائی تھی۔

اِس لیے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انگریزوں نے تو دُوسری جنگِ عظیم کے دوران بھی یہی کہا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ دستور ساز اسمبلی بنا دیں گے، اور جنگ کے دوران میں بھی وہ ہندوستانی رہنماؤں پر مشتمل ایک عبوری حکومت بنانے پر راضی ہیں۔ یہی اُنھوں نے جنگ ختم ہونے کے بعد کر کے دیا۔ تو پھر ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک نے آخر حاصل کیا کِیا؟ سوائے اِس کے کہ کانگرس اُس وقت حکومت میں شریک ہونے کے بجائے چار برس بعد شریک ہوئی اور وہ چار برس اُس نے گھر یا ایوان کے بجائے جیل میں

گزار لیے؟

یہی سوال گاندھی کی دُوسری تحریکوں کے بارے میں بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ آخر ہندوستان کے پورے آئینی سفر میں وہ کون سا مرحلہ تھا جو طے نہ ہُوا ہوتا اگر گاندھی نہ ہوتے؟ جواب وہی بنتا ہے جو ایک کہانی میں ملّا نصرالدین نے دیا تھا۔ مثال مضحکہ خیز ضرور ہے لیکن تاریخی صورتِ حال کے تضاد کو سمجھنے کے لیے شاید ضروری بھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک روز ملّا نصرالدین ایک مکان کی دیوار کو دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا تو اُنہوں نے بتایا، "مکان دُھوپ میں ہے۔ مَیں اُسے دھکیل کر سائے میں لے جانا چاہتا ہُوں۔" لوگ ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے لیکن مُلّا زور لگاتے رہے۔ دن ڈھلنے لگا تو دھوپ بھی دُوسری طرف چلی گئی۔ مُلّا نصرالدین نے فتح مندی کے ساتھ لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور کہا، "دیکھا! میں نے مکان کو سائے میں پہنچا دیا۔"

کانگرس بھی ہندوستان کو سائے میں پہنچانے والی تھی لیکن سورج کچھ اور دیکھ رہا تھا۔

*

دستور ساز اسمبلی ۳۸۹ر نمایندوں پر مشتمل تھی لیکن اُن میں "دیسی ریاستوں" کے نمایندے بھی شامل تھے۔ برطانوی ہند کے نمایندوں کی کُل تعداد ۲۹۲ر تھی۔ اُن میں سے ۷۶ر نشستیں مسلمانوں کے لیے مخصوص تھیں، جن میں سے ۷۳ر مسلم لیگ کے پاس تھیں، یعنی صرف تین کے سِوا مسلمانوں کی باقی تمام نشستیں!

اِس لیے برطانوی حکومت کے لیے اِس بات کو نظر انداز کرنا ناممکن تھا کہ لیگ نے اسمبلی میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ لیگ کے بائیکاٹ کے ہوتے ہُوئے برطانوی حکومت اپنے عوام اور اپنی پارلیمنٹ سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اُن کی بنائی ہوئی اسمبلی پورے ہندوستان کی نمایندگی کرتی ہے، اور اُس کے بنائے ہوئے آئین کو ہندوستان

میں نافذ کیا جا سکے گا۔

اِس لیے دسمبر کے آغاز میں جناح اور لیاقت علی خاں کو وائسرائے، نہرو، سِکھ نمائندے سردار بلدیپ سنگھ اور ایک مختصر وفد کے ساتھ لندن بلایا گیا تاکہ وزیرِ اعظم اُنہیں قائل کرنے کی کوشش کر سکے۔ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی، سوائے اِس کے کہ جناح اور لیاقت نے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے وزیرِ اعظم کی یہ تجویز پیش کر دیں گے کہ لیگ اسمبلی میں شامل ہو جائے۔

اُس کے بعد ایک طرف نہرو ہندوستان واپس چلے گئے جہاں ۹/دسمبر کو اسمبلی کا افتتاح ہُوا۔ دُوسری طرف برطانیہ میں عوام اُس افیون کے اثر سے باہر آنے لگے جو میڈیا اُنہیں ہندوستان کی صورتِ حال کے بارے میں ایک مدّت سے دیتا آ رہا تھا۔ ۱۱/ سے ۱۳/ دسمبر تک پارلیمنٹ میں اِس موضوع پر ایک ہنگامہ خیز بحث ہوئی، جسے جناح نے بھی ممتاز مہمانوں کی گیلری میں بیٹھ کر سُنا۔

سابق وزیرِ اعظم چرچل نے، جو اَب حزبِ مخالف کے قائد تھے، لیبر پارٹی پر اِلزام لگایا کہ وہ کانگرس کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے، اور نہرو کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دے کر اُس نے ایک بھیانک قتلِ عام کو جنم دیا ہے۔ چرچل نے لیبر حکومت سے پوچھا کہ کیا وہ دہلی میں دستور ساز اسمبلی کے اجلاسوں کو معتبر سمجھتی ہے جبکہ مسلم لیگ اُن میں شریک نہیں؟[1]

چرچل مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں دُوسرے انگریزوں سے پیچھے نہ تھے، اور وہ ہندوستان کو متحد رکھ کر اُس پر برطانیہ کی حکومت بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ موجودہ صورتِ حال میں برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے

---

[1] Mitra, *Indian Annual Register*, Jul-Dec 1946, p.310

صرف تین راستے ہیں:

الف: ہندوستان کو اُس کی تقدیر کے حوالے کر کے وہاں سے یونہی چلے آئیں

ب: ہندوستان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیں

ج: برطانوی فوج کے ذریعے اونچی ذات کے ہندوؤں کا غلبہ مسلمانوں اور دُوسری اقلیتوں پر غلبہ قائم کروادیں

چرچل کی اِس صاف گوئی پر خود اُن کی اپنی پارٹی کے ارکان بھی اُن کی حمایت کرنے سے ہچکچائے لیکن لیبر پارٹی کے ایک رُکن کو بالآخر یہ کہنا پڑا کہ برطانیہ کو ہندوستان سے جانے کی ایک تاریخ مقرر کر لینی چاہیے۔[1]

چنانچہ ۲۰ رسے ۲۲ ر دسمبر تک برطانوی کابینہ کا ایک اجلاس ہُوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان چھوڑنے کی تیاری کر لینی چاہیے لیکن اِس کا اعلان کرنے سے پہلے مسلم لیگ کی طرف سے حتمی جواب کر لینا چاہیے۔ کابینہ کے اُس اجلاس میں ہندوستان چھوڑنے کا جو مسوّدہ ترتیب دیا گیا، وہ اِن الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا تھا کہ "ملک معظم کی حکومت کو سخت افسوس ہے کہ ابھی تک یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں ہندوستانی رائے کے تمام بڑے طبقوں کو شامل کیا جاسکے، اور خصوصاً مسلم لیگ کو اب تک اس کی کارروائیوں میں شریک ہونے پر آمادہ نہیں کیا جاسکا..."[2]

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ۲۹ر جنوری سے ۲ر فروری ۱۹۴۷ء تک ہونے والے

---

[1] This was Maj. Woodrow Wyatt; *ibid,* p.312

[2] Nicholas Mansergh *et al.* (ed.), *The Transfer of Power,* Vol.9, p.393۔ مسودے کے اصل انگریزی الفاظ یہ ہیں:

'His Majesty's Government greatly regret that it has not yet proved possible to bring within the Constituent Assembly in India all the major sections of Indian opinion and that the Muslim League, in particular, still find themselves unable to join in its deliberations.'

اجلاس میں اِس بات کی دوبارہ توثیق کر دی کہ لیگ اسمبلی میں نہیں جائے گی۔

۲۰؍ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم ایٹلی نے پارلیمنٹ میں اعلان کر دیا کہ برطانیہ جون ۱۹۴۸ء تک ہر حال میں ہندوستان کا اقتدار اُس کے نمایندوں کے حوالے کر دے گا، یعنی ہندوستان چھوڑ دے گا۔

وزیر اعظم نے وجہ یہ بتائی کہ ''ہندوستانی جماعتوں میں ابھی تک اختلافات ہیں جو دستور ساز اسمبلی کے اُس طرح کام کرنے میں حائل ہو رہے ہیں جیسا کہ اُسے کرنا چاہیے تھا۔'' اِس لیے اگر اقتدار متحدہ ہندوستان کے سپرد نہ کیا جا سکتا تو ''بعض علاقوں میں موجودہ صوبائی حکومتوں کو یا کسی اور طریقے سے'' اقتدار منتقل کر دیا جائے گا۔

*

اِس طرح جناح کی وہ بات درست ثابت ہوئی جو ساتویں باب میں درج کی جا چکی ہے:

''گاندھی جی نے پچیس برس تک اپنی چلائی ہے۔ آپ مجھے دو برس دیجیے، اور میرے ساتھ آیئے۔''[1]

جناح نے وہ بات ۱۵؍ جنوری ۱۹۴۵ء کو کہی تھی۔ اُس کے دو برس، ایک سال اور پانچ دن بعد، ۲۰؍ فروری ۱۹۴۷ء کو، برطانوی وزیر اعظم ہندوستان چھوڑنے کا اعلان کر رہے تھے۔

یہ بھی قابلِ غور ہے کہ یہ آزادی اُسی طریقے سے حاصل ہوئی جو چِت رنجن داس نے ۱۹۲۲ء میں تجویز کیا تھا، اور جسے علامہ اقبال نے فلسفۂ خودی کا ایک عملی پہلو قرار دیا تھا:

۱ داس کے پروگرام کا پہلا نکتہ یہ تھا کہ اقلیتوں کو ضمانت دی جائے کہ آزادی کے

1

بعد اُن کے حقوق ہر ممکن حد تک اُن کی مرضی کے مطابق طے کیے جائیں گے۔ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کے دو بنیادی نکات میں سے ایک یہی تھا، جسے ۱۹۴۶ء کی قرارداد میں برقرار رکھا گیا۔

۲ داس کا تجویز کیا ہُوا دُوسرا اقدم یہ تھا کہ انتخاب میں صرف ایک نکتے کی بنیاد پر حصہ لیا جائے، اور وہ یہ کہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک کا آئین خود بنانے کا حق چاہیے۔ مسلم لیگ نے بھی ۱۹۴۶ء کا انتخاب ایک نکاتی ایجنڈا پر لڑا، جو "پاکستان" تھا۔

۳ داس کے پروگرام کی کامیابی کا انحصار اِس پر تھا کہ پوری قوم متفق ہو کر ایک ہی جماعت کو ووٹ دے تاکہ وہ جماعت اسمبلی کی تقریباً تمام سیٹیں حاصل کر کے اسمبلی میں قوم کی واحد ترجمان بن جائے۔ یہ پورے ہندوستان کی سطح پر نہیں ہو سکتا تھا لیکن مسلم لیگ نے ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں مسلمان قوم کی سطح پر یہ ہدف حاصل کر لیا۔

۴ داس کے منصوبے کی جان اِس بات میں تھی کہ وہ جماعت قوم کی واحد ترجمان بننے کے بعد اسمبلی میں حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دے۔ مسلم لیگ نے بالکل یہی کیا۔

۵ داس کو یقین تھا کہ اگر حقائق کی مدد سے انگریز قوم پر ظاہر کر دیا جائے کہ اُن کے آئین کے مطابق بنی ہوئی ہندوستانی اسمبلی کام نہیں کر سکتی تو وہ ضرور ہندوستان کو آزاد کر دیں گے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، مسلم لیگ نے یہی کر دکھایا اور برطانوی وزیرِ اعظم نے بھی، ۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء کو، ہندوستان چھوڑنے کا اعلان کرتے ہوئے یہی بنیادی وجہ بیان کی۔

اِس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کو آزاد کروانے کا صرف ایک طریقہ تھا، خواہ اُسے کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی مذہب کے لوگ بروئے کار لاتے:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں[1]

چنانچہ جس طرح اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا اور مسلم لیگ نے قائداعظم کی رہنمائی میں اُسے حقیقت بنایا (جس پر موجودہ بنگلہ دیش کی بنیاد بھی ہے)، بالکل اُسی طرح چِت رنجن داس نے ہندوستان کا خواب دیکھا اور مسلم لیگ نے ہی قائداعظم کی رہنمائی میں اُسے بھی حقیقت بنایا۔[2]

---

[1] اقبال، بانگِ درا، ص 309-310

[2] محمد علی جوہر نے لکھا تھا، "داس نے جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا، اُسے کوئی شریف مسلمان نہیں بھول سکتا... خدا ہم سب کو توفیق دے کہ جس طرح وہ اپنے قرضہ سے سبکدوش ہوا ہم بھی اُس کے قرضہ سے سبکدوش ہوں۔" لگتا ہے کہ دعا قبول ہوئی۔

باب ۱۰

نئی سحر

۱۹۴۷ء

قائداعظم نے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ انگریز ہندوستان کو تقسیم کرنے کا اصول تسلیم کر لیں تو ہندو قیادت تین مہینے میں مان جائے گی۔[1]

اگرچہ وزیرِاعظم کے ۲۰؍فروری ۱۹۴۷ء کے اعلان میں پاکستان کا ذکر نہیں کیا گیا تھا لیکن واضح کر دیا گیا تھا کہ اگر مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان کو قبول نہ کیا تو اقتدار "کسی اور طریقے سے" بھی منتقل کر دیا جائے گا۔ گویا تقسیمِ ہند اب ایک تسلیم شدہ امکان تھا۔

نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان روانہ کرتے ہوئے وزیرِاعظم نے اُن کے نام اپنے خفیہ بریف میں لکھا کہ اگر ہندوستان کو تقسیم سے روکا جا سکے تو بہتر ہے۔[2] لیکن مسلم لیگ اپنے مطالبے پر قائم رہی۔

اور تب قائداعظم کی وہ بات بھی پوری ہوئی کہ انگریز ہندوستان کو تقسیم کرنے کا اصول تسلیم کر لیں تو ہندو قیادت تین مہینے میں مان جائے گی۔

۳؍جون ۱۹۴۷ء کو، یعنی ۲۰؍فروری کے اعلان کے تین ماہ اور گیارہ دن بعد، جواہر لال نہرو نے بھی تقسیمِ ہند کے منصوبے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

---

[1] Yusufi, *op. cit.,* p.1838

[2]

اُس منصوبے کے مطابق انگریز جون ۱۹۴۸ء کے بجائے ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو، یعنی صرف دو ڈھائی ماہ بعد رخصت ہو رہے تھے۔ برصغیر میں دو خودمختار ریاستیں وجود میں آ رہی تھیں، ہندوستان (بھارت) اور پاکستان!

*

کانگرس نے اپنی پوری تاریخ میں کبھی کوئی ایسی قرارداد منظور نہ کی تھی، جس میں اُس بھارت کا کوئی مبہم سا تصوّر بھی موجود ہوتا جو اَب وجود میں آ رہا تھا یعنی جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے علاقے شامل نہ ہوں۔ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کا انتخاب بھی کانگرس نے اِسی وعدے پر لڑا تھا کہ وہ ہندوستان کو تقسیم نہیں ہونے دے گی۔

اِس لیے صاف ظاہر تھا کہ اب جو بھارت وجود میں آ رہا تھا، اُس کی خالق بھی کانگرس نہیں بلکہ مسلم لیگ ہی تھی۔ کیونکہ پاکستان کی طرح اُس بھارت کی بنیاد بھی کانگرس کی کسی قرارداد کے بجائے مسلم لیگ کی اپریل ۱۹۴۶ء کی قراردادِ دہلی تھی (جس کا تفصیلی ذکر باب "عہدِ وفا" میں آ چکا ہے)۔

نہرو نے غالباً اِسی شکست پر پردہ ڈالنے کے لیے کچھ ایسے الفاظ استعمال کیے جو نئے الجھاوؤں کو جنم دے گئے۔

۳/ جون کو تقسیم کے منصوبے کی منظوری دیتے ہوئے اُنہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اُن کا دل "مسّرت سے خالی" ہے کیونکہ ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے۔ اِس طرح اُنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کا نام لیے بغیر اُنہیں ہندُوؤں کی خوشیوں کا قاتل قرار دے دیا۔ اُس کے بعد اُنہوں نے کہا کہ اگرچہ مجبوراً تقسیم کو قبول کرنا پڑ رہا ہے لیکن "جغرافیے، تاریخ اور روایت کا ہندوستان، ہمارے دل و دماغ کا ہندوستان، کبھی بدل نہیں سکتا۔"

اپنے وجود کے متعلق ایسا معذرت خواہانہ رویہ ایک شخص کے لیے انفرادی طور پر بھی

زہرِ قاتل بن سکتا ہے۔ لیکن بھارت جیسی بڑی ریاست اپنے متعلق یہ رویہ اختیار کرنا، جبکہ وہ ریاست رقبے کے لحاظ سے دنیا کی ساتویں بڑی ریاست اور کُل انسانی آبادی کے پندرہ بیس فیصد کا گھر ہو، پورے خطے کے لیے نئی مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔

چنانچہ ۸/ جون کو ہندُو مہاسبھا کی آل انڈیا کمیٹی نے تقسیمِ ہند کے موضوع پر اپنی قرارداد میں کانگرس کے خلاف غصے کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ''ہندُو، کانگرس کے اِس فیصلے کے پابند نہیں ہیں''، اور:

> یہ بات ایک دفعہ پھر واضح کی جاتی ہے کہ ہندوستان ایک اور ناقابلِ تقسیم ہے، اور یہ کہ کبھی امن قائم نہ ہو گا جب تک کہ علیحدہ ہونے والے علاقوں کو واپس انڈین یونین میں شامل کر کے انہیں مکمل طور پر اس کا حصہ نہ بنا لیا جائے۔[1]

یہ کہنا کہ ہم ''کانگرس کے اِس فیصلے کے پابند نہیں ہیں''، بھارت کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کے مترادف تھا۔ اِس قرارداد کے ذریعے عملاً ہندُوؤں کے اُس بہت بڑے طبقے نے جس نمایندگی مہاسبھا کرتی تھی، ایک طرح سے یہ طے کر لیا کہ وہ ایک ایسی ریاست میں رہیں گے جس کے قیام کو وہ تسلیم ہی نہیں کرتے۔ تقریباً ایک سو برس پہلے انگریزی تعلیم نے ماضی کے مسلمان بادشاہوں کے خلاف جو نفرت پیدا کی تھی وہ بڑھتے بڑھتے اب خود اپنے وجود سے نفرت بن گئی تھی۔

اُس کے ایک ہفتے بعد، ۱۶/ جون ۱۹۴۷ء، کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اپنی جس قرارداد کے ذریعے تقسیم کے منصوبے کی توثیق کی، وہ بھی توجہ کے لائق ہے۔

اُس قرارداد میں ایک طرف تو نہرو کی ۳/ جون کی تقریر کے ''جغرافیے، تاریخ اور روایت کے ہندوستان'' کے معذرت خواہانہ تصوّر کی وضاحت کی گئی کہ ''جغرافیے اور

[1] Mitra, *Indian Annual Register Jan-Jun 1947,* pp.256-257

پہاڑوں اور سمندروں نے ہندوستان کو اُس طرح تشکیل دیا ہے جیسا وہ ہے، اور کوئی انسانی قوّت اُس تشکیل کو بدل نہیں سکتی اور اُس کی اٹل تقدیر کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔" اِس لیے "ہم نے ہندوستان کی جس تصویر سے محبت کرنا سیکھا ہے، وہ ہمارے دل و دماغ میں برقرار رہے گی۔"

دُوسری طرف مہاسبھا کے اِس عزم کو بھی، کہ پاکستان کو ختم کر کے دوبارہ بھارت میں ضم کیا جائے، کانگرس نے نسبتاً میٹھے الفاظ میں گھول کر پیش کر دیا کہ:

> اقتصادی حالات اور بین الاقوامی اُمور کے پرزور تقاضے ہندوستان کی وحدت کو اور بھی ضروری بناتے ہیں... آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو یقین اور اعتماد ہے کہ جب موجودہ جذبات ماند پڑ جائیں گے تو ہندوستان کے مسائل کو اُن کے صحیح تناظر میں دیکھا جائے گا اور ہر ایک اِس باطل نظریے سے دستبردار ہو جائے گا کہ ہندوستان میں دو قومیں ہیں۔[1]

یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا کہ ایک ریاست اپنی بنیاد اِس قسم کے خیالات پر رکھ رہی تھی۔

*

اِس شکست خوردہ انتقامی رویے نے ہندوستان کی تقسیم سے متعلق ہر معاملے کو اُلجھانا شروع کر دیا۔ سب سے بڑا معاملہ دونوں ریاستوں کے علاقے کا تعین تھا۔

اگر برطانیہ نے ۱۸۵۸ء سے اُس تجویز پر عمل کیا ہوتا جو اُس کے صاحبِ بصیرت سیاستداں جان برائٹ نے پیش کی تھی (جس کا ذکر دوسرے باب "تمام انسانوں کی رُوح" کیا جا چکا ہے)، تو صورتِ حال خاصی بہتر ہوتی۔ لیکن برطانوی حکمراں "متحدہ ہندوستان" کے جس جھوٹے مفروضے پر قائم رہے تھے، اُس کی قلعی اِس طرح کھلی کہ جون ۱۹۴۷ء

---

[1] Mitra, *op. cit.,* p.123

میں ہندوستان کے گیارہ صوبوں اور ۵۶۲ دیسی ریاستوں میں سے تقریباً ہر ایک کی تقدیر کے فیصلے کے لیے ایک الگ طریقہ تجویز کرنا پڑ رہا تھا۔

جو صوبے پاکستان میں شامل ہو رہے تھے، اُن میں سے سندھ میں ۲۶/ جون کو صوبائی اسمبلی میں پاکستان سے الحاق کے حق میں قرارداد پیش کی گئی۔ تینتیس (۳۳) ارکان نے قرارداد کے حق میں ووٹ دیا۔ اُن میں مسلم لیگی ممبروں کے علاوہ آزاد بعض اُمیدوار بھی شامل تھے۔ مخالفت میں بیس (۲۰) ارکان نے ووٹ ڈالے جو تقریباً سبھی کانگرسی یا آزاد ہندو اُمیدوار تھے۔ اِس طرح اکثریت کی رائے سے سِندھ پاکستان میں شامل ہو گیا۔

بلوچستان، برطانوی ہند کے اُن صوبوں میں سے تھا، جنہیں "چیف کمشنر کے صوبے" (Chief Commissioner's Provinces) کہا جاتا تھا۔ ایسے صوبوں میں گورنر، منتخب اسمبلی اور جمہوری ادارے متعارف نہیں کروائے گئے تھے۔ اُس کے بجائے صرف ایک چیف کمشنر اور اُس کا بنایا ہُوا مشاورتی ادارہ حکومت کرتا تھا۔ بلوچستان میں یہ مشاورتی ادارہ قبائلی عمائدین پر مشتمل "شاہی جرگہ" تھا۔

چونکہ یہ سوال غیر معمولی نوعیت رکھتا تھا کہ بلوچستان کس ملک میں شامل ہو، اِس لیے شاہی جرگے کے ساتھ ساتھ کوئٹہ شہر کی میونسپلٹی کے اِکیس منتخب نمایندوں کو بھی فیصلے میں شریک کر لیا گیا۔

۲۹/ جون کو کوئٹہ میں چیف کمشنر کی سربراہی میں یہ مشترکہ اجلاس ہُوا۔ جرگے کے چوّن (۵۴) افراد کے ووٹ پاکستان میں شامل ہونے کے حق میں تھے، اور بھارت میں شامل ہونے کے حق میں کوئی ووٹ نہ تھا۔ کوئٹہ میونسپلٹی کے نمایندوں میں سے چھ نے پاکستان اور تین نے بھارت کے حق میں ووٹ میں دیئے۔

اِس طرح تین کے مقابلے میں ساٹھ ووٹوں کے ذریعے بلوچستان نے پاکستان میں

شامل ہونے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔

بنگال اور پنجاب اگرچہ مسلم اکثریتی صوبے تھے لیکن وہ اِتنے بڑے صوبے تھے کہ وہاں ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد بھی آباد تھی (اور پنجاب میں سِکھ بھی رہتے تھے)۔ اِس لیے اُن دونوں صوبوں کو تقسیم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ''مشرقی بنگال'' پاکستان میں شامل ہو گیا (اور ۱۹۵۶ء تک مشرقی بنگال ہی کہلاتا رہا، جس کے بعد اُسے مشرقی پاکستان کا نام دیا گیا)۔ ''مغربی بنگال'' بھارت کا حصہ بنا۔ اِسی طرح ''مغربی پنجاب'' پاکستان میں، اور ''مشرقی پنجاب'' بھارت میں شامل ہُوا۔

اُن دونوں صوبوں اور بعض دُوسرے علاقوں میں سرحدوں کا تعین کرنے کے لیے ایک باؤنڈری کمیشن بنایا گیا، جس نے آزادی کے ایک آدھ روز بعد تفصیلات کا اعلان کرنا تھا۔ اُس اعلان کے ہوتے ہی اُس ہولناک خونریزی کا آغاز ہُوا ''۱۹۴۷ء کے فسادات'' جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے (چونکہ اُن واقعات کا اصل زور آزادی کے بعد شروع ہُوا، اِس لیے وہ اپنی بے پناہ اہمیت کے باوجود اِس کتاب کے دائرے سے باہر ہیں)۔

آسام کی صورتِ حال بنگال اور پنجاب کے برعکس تھی۔ وہ ایک ہندُو اکثریتی صوبہ تھا لیکن اُس کے ایک بڑے ضلع، سِلہٹ، میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اِس لیے مسلم لیگ اُسے مشرقی بنگال کے ساتھ ملا کر پاکستان کا حصہ بنانا چاہتی تھی۔ دُوسری طرف وہ ضلع اپنے بعض وسائل، بالخصوص چائے کے باغات، کی وجہ سے آسام کے باقی صوبے کے لیے بھی اہمیت رکھتا تھا۔ اِس لیے بھارت بھی اُسے ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اِس لیے سِلہٹ میں اِس سوال پر ریفرنڈم کروانا پڑا۔ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے انتخابی مہم میں ایک دُوسرے کے خلاف کافی زور لگایا۔ ۶/ اور ۷/ جولائی کو ووٹ ڈالے گئے، جن میں پچپن (۵۵) فیصد پاکستان کے حق میں تھے، اِس لیے سِلہٹ مشرقی بنگال میں شامل کر دیا گیا۔

اِن سب سے مختلف صورتِ حال شمال مغربی صوبے یعنی صوبۂ سرحد کی تھی (جسے اب خیبر پختونخوا کہتے ہیں)۔ یہ مسلم اکثریتی صوبہ تھا لیکن ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں یہاں کانگرس نے اکثریت حاصل کی تھی۔ تاہم اُن انتخابات کے وقت صوبے کے عوام کے سامنے یہ صورت حال موجود نہ تھی کہ اُن کے اطراف میں پاکستان ایک حقیقت بن چکا ہو۔ اِس لیے فیصلہ ہُوا کہ یہاں بھی ایک ریفرنڈم میں واضح طور پر پوچھا جائے گا کہ لوگ پاکستان اور بھارت میں سے کس ملک کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں۔

ریفرنڈم کے لیے ۷/ جولائی سے ۱۶/ جولائی کی تاریخیں مقرر کی گئیں۔ لیکن اُس سے پہلے ہی کانگرس نے ایک ایسی پَست حرکت کی جس کی توقع کسی بھی زمانے میں ایک معتبر سیاسی جماعت سے ہر گز نہیں کی جا سکتی۔ ۲۱/ جون کو کانگرس کی صوبۂ سرحد کی شاخ نے قرارداد منظور کی کہ پختونستان کی آزاد ریاست قائم کی جائے، جہاں ”ریاست کا آئین جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف کے اسلامی اصولوں کی بنیاد پر تشکیل دیا جائے گا۔“ اِس لیے پختون ”کسی غیر پختون تسلط کو قبول نہ کریں۔“ مُراد یہ تھی کہ وہ پاکستان میں شمولیت کے سوال پر ہونے والے ریفرنڈم میں حصہ نہ لیں، اور پاکستان کو تسلیم نہ کریں۔[1]

یہ قرارداد، جسے ”قراردادِ پختونستان“ کہا گیا، خان عبدالغفار خاں (”باچا خاں“) اور اُن کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کے ایمأ پر منظور ہوئی۔ اگرچہ خدائی خدمتگار کے نام سے اُن کی ایک اپنی جماعت بھی تھی جو کانگرس کی حلیف تھی، لیکن قرارداد میں صوبائی کانگرس کمیٹی اور کانگرس پارلیمانی پارٹی نے بھی اپنی منظوری شامل کی۔

یہ ۳/ جون کے اُس منصوبے کی کھلی ہُوئی خلاف ورزی تھی جسے کانگرس نے منظور کیا تھا۔ نہرو کی ”جغرافیے، تاریخ اور روایت کے ہندوستان“ والی لغو گوئی رنگ لا رہی تھی۔

---

[1] Tendulkar, *Abdul Ghaffar Khan,* p.439

اگرچہ نہرو نے اپنے آپ کو قراردادِ پختونستان سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ اُن کے شایانِ شان تھا۔ لیکن گاندھی نے فوراً اِس تحریک کو آشیرباد دے دی۔ [1]

۲۸ر جون کو قائداعظم نے اِس قرارداد کے خلاف ایک طویل بیان جاری کیا جو آج بھی پڑھے جانے کے لائق ہے کیونکہ اُس میں ایسے بہت سے رجحانات کی نشاندہی کی گئی ہے جو آج بھی پاکستان کے وجود کے لیے خطرہ بنے ہُوئے ہیں۔

اُس بیان میں قائداعظم نے صوبے کے عوام اپیل کی کہ وہ ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالیں۔ دُوسری طرف صوبائی کانگرس نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا۔ ننانوے فیصد ووٹ پاکستان کے حق میں آئے اور صوبہ سُرحد پاکستان میں شامل ہو گیا (اگرچہ بعض ناقدین یہ کہہ کر اِس بنیاد پر سوال اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ رجسٹرڈ ووٹروں میں سے ۴۹ فیصد نے ووٹ نہیں ڈالے تھے، لیکن بہرحال ریفرنڈم کے فیصلے کو صرف اُنہی قواعد کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے جو ۳ر جون کے منصوبے کے تحت طے ہوئے تھے)۔

اِن معاملات کا ایک افسوسناک پہلو یہ تھا کہ قراردادِ پختونستان کے ذریعے کانگرس نے پاکستان کے قائم ہونے سے پہلے ہی یہاں علیحدگی پسندی کی ایک ایسی بنیاد رکھ دی جو اگرچہ کبھی مقبول نہ ہُوئی لیکن جس کے منفی اثرات ظاہر تھے۔

اُس کے علاوہ ایک بااثر قبائلی رہنما مرزالی خاں بھی، جو فقیر آف اپی کہلاتے تھے، قراردادِ پختونستان کے داعیوں میں سے تھے اور آنے والے برسوں میں وہ ریاستِ پاکستان کے خلاف ایک مسلح جدوجہد کرتے رہے۔ بعض محققین کے مطابق اُنہوں نے دس بارہ برس بعد پاکستان کو تسلیم کر لیا۔ لیکن قراردادِ پختونستان کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اُس میں ''اسلامی اصولوں کی بنیاد پر'' ایک شرعی حکومت کے نفاذ کا مطالبہ تھا، اور ریاستِ

1

پاکستان کے خلاف مسلح جدوجہد بھی یہی کہہ کر شروع کی گئی۔ اِس لحاظ سے جہاں یہ قرارداد پاکستان میں لسانی بنیادوں پر علیحدگی پسندی کی مُوجد ہے، وہیں کسی نہ کسی حد تک مذہب کے نام پر ہونے والی دہشت گردی کی بانی بھی نظر آتی ہے۔ اِس روشنی میں دیکھا جائے تو آج کے ''فتنۂ خوارج'' کا پہلا سایہ بھی جون ۱۹۴۷ء میں پڑ چکا تھا اور اُس کے سرپرست گاندھی تھے، جنہوں نے اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کو پسِ پشت ڈال کر قراردادِ پختونستان کو آشیرباد دی۔

*

برطانوی ہند کے باقی صوبے بھارت میں شامل ہو گئے۔

اُن میں سے مشرقی پنجاب، مغربی بنگال اور آسام کے علاوہ، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ باقی صوبے مدراس، بمبئی، یوپی، سی پی برار، بہار، اڑیسہ، دہلی، اجمیر مرواڑہ، کُورگ، اور جزائر انڈمان و نکوبار تھے۔ اِن میں سے آخری چاروں ''چیف کمشنر کے صوبے'' تھے۔

اِن میں سے کسی صوبے میں بھی مسلم لیگ کی طرف سے بھارت کے لیے وہ مشکلات پیدا نہیں کی گئیں جو کانگرس نے پاکستان کے ہر صوبے کے الحاق کے حوالے سے پیدا کی تھیں۔ کیونکہ پاکستان میں جو بھی صوبہ شامل ہُوا، اُسے کانگرس بھارت میں شامل کرنے کی خواہشمند رہ چکی تھی۔ جبکہ مسلم لیگ نے کبھی اُن صوبوں کو پاکستان میں شامل کرنے کی تمنّا نہیں کی تھی جو بھارت میں شامل ہو رہے تھے۔ بلکہ اُن صوبوں کا بھارت میں شامل ہونا بھی مسلم لیگ کی قراردادِ دہلی کے عین مطابق تھا۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، بھارت کی تشکیل بھی دراصل مسلم لیگ کی قرارداد دہلی ہی کے مطابق ہو رہی تھی۔

اِس طرح کانگرس کی عاقبت نااندیشی نے اُسے کئی برسوں تک پاکستانی صوبوں کی آبادی کے ذہنوں میں قیامِ پاکستان کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی جدوجہد میں مصروف

رکھا تھا۔ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا کہ وہ اثرات پاکستان کی مُسلم اور غیر مُسلم آبادی کے ذہنوں میں کس حد تک راسخ ہو گئے ہیں، اور پاکستانی معاشرے کے لیے کس قسم کی مشکلات پیدا کریں گے۔

لیکن مسلم لیگ کی طرف سے بھارتی صوبوں میں ایسی کوئی دشواری پیدا نہیں کی گئی تھی۔ پچھلے سات برس میں مسلم لیگ کی طرف سے پاکستان کے قیام کے لیے جو تحریک چلی، اُس میں مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو، جو اَب بھارت میں شامل ہو رہے تھے، کسی اور ہی بات کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

اُنہیں بتایا گیا تھا کہ جب مسلم اکثریتی صوبوں میں پاکستان بن جائے گا تو اقلیتی صوبوں کے مسلمان، ہندوستان ہی میں رہیں گے۔ وہ بھارت کے محبِ وطن شہری ہوں گے، ایک باوقار اقلیت کے طور پر اُس ریاست کی تعمیر اور ترقی میں اپنا کردار ادا کریں گے، اور وہاں کی حکومت کے وفادار ہوں گے۔ اب وہ وقت آ گیا تھا۔

*

لیکن دیسی ریاستوں کا معاملہ کہیں زیادہ پیچیدہ تھا۔

برطانوی ہند اُنہی صوبوں پر مشتمل تھا جن کا ابھی ذکر ہُوا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، یہ ہندوستان کے کُل رقبے کے صرف پینسٹھ فیصد کے قریب تھا۔ بقیہ پینتیس فیصد کے قریب حصہ متعدد "دیسی ریاستوں" پر مشتمل تھا، جنہوں نے براہِ راست تاجِ برطانیہ کے ساتھ معاہدے کر رکھے تھے۔ اُن معاہدوں کی شرائط ہر حکمران کے لیے الگ تھیں۔

۱۹۴۷ء میں اُن ریاستوں کی تعداد تقریباً پانچ سو باسٹھ (۵۶۲) شمار کی جاتی تھی۔ وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے اُنہیں اطلاع دی گئی کہ ۱۴/ اگست کی رات برطانوی ہند کے ساتھ ساتھ تمام ریاستوں پر بھی انگریزوں کی بالادستی ختم ہو جائے گی۔

اُس کے ساتھ ہی تمام ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ برطانیہ کے معاہدے بھی منسوخ ہو جائیں گے۔

اِس طرح قانونی اعتبار سے ہر ریاست خود مختار ہو جائے گی۔ لیکن عملاً کسی ریاست کا خود مختار رہنا ممکن نہ ہو گا کیونکہ برطانیہ کسی بھی ریاست کی آزادی کی نگرانی یا ضمانت نہیں دے گا۔

اِس لیے دیسی حکمرانوں کو دونوں نئے ڈومینینز، یعنی پاکستان اور بھارت، میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرنا ہو گا۔ اُس کے لیے حکمراں دو اُصول پیشِ نظر رکھیں:

۱ زمینی طور پر ریاست کس ڈومینین کے ساتھ متصل ہے؟ یعنی ریاست کا علاقہ بھارت اور پاکستان میں سے جس کے ساتھ جُڑا ہُوا ہے، ریاست اُسی ڈومینین میں شامل ہونے کو ترجیح دے۔

۲ ریاست کے عوام کی خواہش کیا ہے؟ یعنی اِس بات کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ عوام دونوں میں سے کس ملک میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

جب تک ایک ریاست الحاق کا فیصلہ نہ کر لے، وہ دونوں میں سے کسی بھی ڈومینین کے ساتھ ''معاہدۂ جمود'' (standstill agreement) کر سکتی ہے تاکہ بعض ضروری سہولیات فراہم ہو سکیں، مثلاً آمد و رفت وغیرہ۔

چھوٹی اور درمیانی ریاستوں نے میں سے کئی ایک نے ۱۴ر اگست سے پہلے ہی الحاق کے کاغذات جمع کروا دیئے یا آمادگی ظاہر کر دی، مثلاً بھارت کے حق میں بڑودہ، بیکانیر، گوالیار اور پٹیالہ، اور پاکستان کے حق میں سوات، دیر اور چترال۔ بہاولپور کے نواب صادق عباسی پہلے ہی سے تحریکِ پاکستان کے زبردست حامی رہے تھے۔

البتہ پاکستان سے متصل ریاستوں میں سے رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑی ریاست،

قلات، کے حکمراں نے آزاد رہنے کا اعلان کر دیا۔ برصغیر کی سب سے بڑی دیسی ریاست حیدرآباد (دکن) کے حکمراں کے بھی یہی ارادے دکھائی دے رہے تھے۔ جموں و کشمیر سمیت کئی بڑی ریاستوں نے آخری گھڑی تک کوئی فیصلہ نہ کیا۔

اِس طرح آزادی کے لمحے پر بھی ایک چوتھائی برصغیر کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔ اور یہ وہ بھان متی کا کنبہ تھا جسے انگریزی استعمار نے مدتوں تک ''ایک ملک اور ایک قوم'' کہنے کا ڈھونگ رچائے رکھا تھا۔

*

۱۸؍جولائی ۱۹۴۷ء کو شاہِ برطانیہ نے قانون آزادیٔ ہند (Indian Independence Act) کی توثیق کر دی۔

اگرچہ کانگرس کئی برس تک یہ عہد دہراتی رہی تھی کہ ہندوستان کبھی دولتِ مشترکہ میں شامل نہ ہو گا لیکن اب وہ دولتِ مشترکہ میں شمولیت کی حامی بھر چکی تھی۔ دونوں نئی ریاستیں ڈومینین ہی کے طور پر وجود میں آ رہی تھیں۔

بھارت کے پہلے گورنر جنرل کے طور پر کانگرس نے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو نامزد کیا۔ مسلم لیگ نے پاکستان میں اِس عہدے کے لیے قائداعظم کو نامزد کیا۔

۷؍اگست کو قائداعظم کراچی پہنچے جو نئی ریاست کا دارالحکومت بننے والا تھا۔ دو روز بعد عوام سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا، ''میں نے یہ کام تنہا نہیں کیا ہے۔ میرے ساتھ لاکھوں تھے، خاص طور پر عوام۔ پڑھا لکھا طبقہ آخر میں آیا؛ عوام پہلے آئے۔''[1]

۱۰؍اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں صبح دس بجے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا

---

1 Saleena Karim, *Secular Jinnah & Pakistan,* p.315

اجلاس سندھ سیکریٹریٹ کی عمارت میں شروع ہوا۔[1]

پاکستان اُس وقت آبادی کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست تھا(اس کی آبادی تقریباً ساڑھے سات کروڑ تھی)۔ رقبے کے لحاظ سے یہ دنیائے اسلام میں چوتھے نمبر پر تھا(آزاد مسلمان ریاستوں میں سے صرف سعودی عرب، ایران اور مصر کا رقبہ پاکستان سے زیادہ تھا)۔

تاریخ نے بڑی حیرت کے ساتھ دیکھا کہ دنیا کی اس سب سے بڑی مسلم ریاست کے نامزد وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے ریاست کی دستور ساز اسمبلی کے عارضی چیئرمین کے طور پر ایک "اچھوت" (دلِت) ہندُو کا نام تجویز کیا، جوگندر ناتھ منڈل!

خواجہ ناظم الدین نے تائید کی، اور یوں پاکستان کی تاریخ کا پہلا خطاب ایک غیر مسلم کی زبان سے بلند ہُوا۔ اور اُسی غیر مسلم نے مسلمانوں کی طرف سے اِس ریاست کے قیام پر خدا کا شُکر ادا کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔

منڈل کی تقریر کا آغاز اِن الفاظ سے ہُوا:

> خواتین و حضرات! کسی اور چیز سے پہلے میں خدائے بزرگ و برتر کے سامنے اپنا سر جھکانا چاہوں گا اس کی اس مہربانی کے لیے کہ اُس نے ہم سب کو یہاں جمع ہونے اور اُس سے یہ دعا کرنے کا موقع دیا ہے کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھائے۔

اُس کے بعد اُنہوں نے کہا کہ "اقلیتی برادری کے ایک رُکن کا چیئرمین منتخب ہونا پاکستان کی پیدایش پر بہت اچھا شگون ہے، کیونکہ آج پاکستان ایک اقلیتی برادری، ہندوستان کے مسلمانوں، کے مستقل اور جائز مطالبے کا نتیجہ ہے۔" مستقبل کے بارے میں اُنہوں نے

---

[1] اجلاس کی کاروائیوں کی تمام تفصیلات جو یہاں پیش کی جارہی ہیں ان کا ماخذ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا ریکارڈ ہے۔ دیکھیے،
Constituent Assembly of Pakistan Debates Official Report (1947-54)

توقع ظاہر کی کہ:

> صرف پاکستان اور ہندوستان کے لوگ ہی نہیں بلکہ ساری دنیا پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی طرف دیکھے گی اور خود ہی دیکھ لے گی کہ وہ ملّتِ اسلامیہ جو اپنے جائز حقوق و اختیارات حاصل کرنے میں ثابت قدم تھی اور پاکستان کی علیحدہ ریاست حاصل کرنے میں ثابت قدم تھی، پاکستان میں رہنے والی اقلیتوں کے ساتھ صرف عدل وانصاف ہی نہیں بلکہ فراخدلی کے برتاؤ میں کبھی کمی نہیں کرے گی، اور یہ میرے لیے سب سے زیادہ طمانیت کی بات ہے۔

آخر میں اُنہوں نے کہا کہ "اقلیتی برادری پر بھی لازم ہے کہ اپنازاویۂ نگاہ تبدیل کرے اور پاکستان میں رہنے والی تمام ملّتوں کو چاہیئے کہ اب ایک دوسرے پر اعتماد کریں۔ عدم اعتماد، نفرت، دشمنی اور رقابت کی جگہ اب اعتماد، محبت، دوستی اور باہمی تعاون کو ملنی چاہیے۔"

اگرچہ کچھ برس بعد منڈل کو پاکستانی حکومت سے شکایات ہو گئیں اور وہ بھارت چلے گئے لیکن بہر حال تاریخ کے حقائق میں اُن کا یہ اعزاز محفوظ ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی کاروائی میں اُن کی یہ تقریر "چیئرمین کا افتتاحی خطبہ" کے عنوان سے درج ہُوئی (بعض نالائق موٗرخ اگلے روز ہونے والی قائداعظم کی تقریر کو اسمبلی کی افتتاحی تقریر سمجھ بیٹھتے ہیں، جو ظاہر ہے کہ درست نہیں)۔

اسمبلی کے ارکان کے رجسٹر میں بھی سب سے منڈل نے اپنا نام لکھا۔ اُن کے بعد قائداعظم نے، اور پھر لیاقت علی خاں، عبداللہ محمود، خواجہ ناظم الدین اور دُوسروں نے اپنے نام لکھے۔

پہلے دن صرف رسمی ضابطوں سے متعلق قراردادیں پیش کی گئیں اور کہا گیا کہ اسمبلی کی مستقل صدارت کے اُمیدوار نامزدگی کے کاغذات شام چار بجے تک جمع کروادیں۔

*

اسمبلی کے مستقل صدر کے لیے صرف قائداعظم کا نام پیش کیا گیا۔

اگلے دن، ۱۱/ اگست ۱۹۴۷ء، کے اجلاس میں، قائداعظم کا انتخاب ہو جانے کے بعد منڈل نے کرسیِ صدارت اُن کے سپرد کر دی۔

مبارکباد کی تقاریر لیاقت، کرن شنکر رائے، محمد ایوب کھوڑو، منڈل، ابوالقاسم خاں اور بیگم جہان آرا شاہنواز نے پیش کیں۔ شنکر کا تعلق کانگرس پارٹی سے تھا۔ مبارکباد دینے کے ساتھ ساتھ کہا، "جہاں تک ہمارا تعلق ہے جناب، آپ کے ذہن میں جو پاکستان ہے اگر وہ ایک سیکولر جدید جمہوری ریاست ہے... تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو ہمارا بھرپور تعاون حاصل ہو گا۔"

بڑی عجیب بات تھی کہ ایک پارلیمنٹ کا رُکن اپنے تعاون کو اِس طرح مشروط کر رہا تھا کہ اگر ریاست میں اُس کی پسند کا نظام نافذ ہُوا صرف تب ہی وہ ریاست کے ساتھ تعاون کرے گا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بے موقع بات شنکر کے اگلے جملوں میں تھی:

> ...صاف بات یہ ہے جناب کہ ہم خوش نہیں ہیں۔ ہم ہندوستان کی اِس تقسیم کی وجہ سے ناخوش ہیں۔ ہم پنجاب کی تقسیم کی وجہ سے ناخوش ہیں۔ ہم بنگال کی تقسیم کی وجہ سے بھی ناخوش ہیں۔ لیکن چونکہ یہ بندوبست دونوں عظیم جماعتوں کے درمیان طے پا چکا ہے، ہم اسے وفاداری کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور وفاداری کے ساتھ اس کے لیے کام کریں گے۔

یوں ریاست کے آغاز پر ہی اُس کی اپنی پارلیمنٹ میں اُس کے وجود پر سوال اُٹھایا جا رہا تھا۔ دنیا کی کوئی ریاست گوارا نہیں کر سکتی کہ اُس کی پارلیمنٹ کے افتتاحی اجلاس میں یہ کہا جائے کہ وہ ریاست وجود میں نہ آتی تو بہتر تھا۔ لیکن جب سرحد کے دُوسری طرف

کانگرس ہی اپنی قرارداد میں پاکستان کو ایک عارضی ریاست قرار دے چکی تھی، اور کہہ چکی تھی کہ پاکستان کے خاتمے کی منتظر رہے گی، تو اُس جماعت کی پاکستان شاخ سے کیا توقع کی جاسکتی تھی؟

قائداعظم نے اپنی تقریر میں پہلے سے تیار کیے ہوئے نکات کے علاوہ شنکر کی باتوں کا جواب بھی دیا۔ برصغیر کی تقسیم کے بارے میں اُنہوں نے کہا، ''میں سمجھتا ہُوں کہ کوئی اور حل نہیں تھا اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی تاریخ اس کے حق میں اپنا فیصلہ دے گی۔ اور مزید برآں، جیسے جیسے ہم آگے بڑھیں گے، عملی تجربے سے یہ ثابت ہوتا جائے گا کہ یہ ہند کے آئینی مسائل کا واحد حل تھا۔''

اُنہوں نے انگلستان کی تاریخ سے مثال دیتے ہوئے سمجھایا کہ وہاں اقلیتوں کے حقوق متعین ہونے میں دوڈھائی سو برس کا عرصہ لگ گیا تھا۔ لیکن اُس تمام عرصے میں وہاں کی اقلیتوں نے بھی باقی شہریوں کی طرح اپنی ذمہ داریاں پوری کیں اور ''وہ اُس آگ میں سے ایک ایک قدم کرکے گزرے۔'' اِس لیے اب وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسنٹنٹ کے درمیان کوئی فرق نہیں، اور ''جو بات اب وجود رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص برطانیہ کا شہری ہے، ایک برابر کا شہری، اور وہ سب ایک قوم کے افراد ہیں۔''

یہ مثال دینے کے بعد قائداعظم نے کہا:

> اب، میرا خیال ہے کہ ہمیں اِس بات کو نصبُ العین کے طور پر سامنے رکھنا چاہیے اور آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے، مذہبی معنوں میں نہیں، کیونکہ وہ ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے، بلکہ سیاسی معنوں میں ایک ریاست کے شہریوں کے طور پر۔

آج قائداعظم کے اِن الفاظ میں سے بعض لوگ اپنے دل کا مطلب اخذ کر لیتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ الفاظ کوئی نئی پالیسی نہیں بلکہ پرانے معاہدوں کی توثیق تھے۔ قائداعظم نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جو ۱۹۳۲ء میں اقلیتوں کے اُس معاہدے میں طے نہ کر دی گئی ہو جسے دُوسری گول میز کانفرنس کے دوران مسلم نمایندوں نے اقلیتوں کے ساتھ طے کیا تھا۔ اور تاریخی طور پر وہی معاہدہ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان میں بیان کیے گئے اقلیتوں کے حقوق کے لیے بھی ایک نظیر کی حیثیت رکھتا تھا۔

اسمبلی کے اِسی اجلاس میں لیاقت علی خاں نے پاکستان کا قومی پرچم پہلی دفعہ پیش کیا۔ اُنہوں نے کہا، ''کسی بھی ملک کا پرچم صرف ایک کپڑے کا ٹکڑا نہیں ہوتا۔ اصل اہمیت اُس کپڑے کی نہیں بلکہ اُس کے معانی کی ہوتی ہے۔'' پاکستان کے پرچم کے بارے میں اُنہوں نے کہا کہ ''اِس کے معانی اِس پرچم کے تمام وفاداروں کی اُخوت، آزادی اور مساوات[1] کے ہوں گے''، اور ''یہ پرچم صرف پاکستانی قوم کے لیے آزادی کا پرچم نہیں ہو گا۔ یہ پرچم دنیا بھر میں امن برقرار رکھنے میں مدد کرنے کے لیے امن کی علامت ہو گا۔''

کانگرسی ارکان نے پرچم پر اعتراضات کیے لیکن ایوان کی اکثریت نے ان کی قرارداد مسترد کر دی، جس کے بعد کانگرس پارٹی کے نمایندے نے کہا کہ وہ پرچم کو قبول کرتے ہیں۔

۱۲ ر اگست کے اجلاس میں لیاقت علی خاں نے قرارداد پیش کی کہ سرکاری دستاویزات میں جناح کو مخاطب کرنے کے لیے ''قائداعظم محمد علی جناح'' کے الفاظ استعمال کیے جائیں (سرکاری طور پر قائداعظم کے انگریزی ہجے "Quaid-i-Azam"

---

[1] اسمبلی کے ریکارڈ میں ''freedom, liberty and equality'' درج ہے جو ظاہراً غلط ہے۔ اس کی جگہ ''fraternity, liberty and equality'' کہا گیا ہو گا۔ *Constituent Assembly of Pakistan, op. cit.,* p.22

لکھے جاتے تھے)۔ اسمبلی میں واضح کیا گیا کہ جناح کی حد تک یہ لقب انگریزی محاورے "ہز ایکسی لنسی" (His Excellency) اور یوئر ایکسی لنسی (Your Excellency) کے الفاظ کا مترادف ہو گا، جو دُوسرے گورنر جنرلوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

کانگرسی نمایندوں نے اِس پر بھی اعتراض کیا لیکن اکثریت نے قرارداد کو منظور کیا۔

*

۱۳/ اگست کو ماؤنٹ بیٹن کراچی پہنچے تا کہ اگلے روز اقتدار منتقل کر دیں۔

رات کو اُن کے اعزاز میں ڈنر دیا گیا۔ قائداعظم نے شاہِ برطانیہ جارج ششم کا جامِ صحت تجویز کرتے ہوئے جو خطاب کیا، اُسے اُن کی اور مسلم لیگ کی طرف سے برطانوی راج کی نوّے سال کی تاریخ پر حتمی تبصرہ سمجھنا چاہیے۔

جناح نے کہا کہ جب ملکہ وکٹوریہ نے، جو "ایک عظیم اور نیک ملکہ" تھیں، حکومتِ ہند کو اپنے ہاتھ میں لیا، تب ہی یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ ایک آزاد ریاست بننے کی طرف ہندوستان کی رہنمائی کرنا برطانوی قوم کا واضح مقصد ہو گا۔ ملکہ وکٹوریہ کے وقت سے، بلکہ اُن سے پہلے ۱۸۳۳ء میں لارڈ میکالے کی تقریر کے زمانے ہی سے، برطانوی پالیسی میں "اِس اُصول کے بارے میں کوئی سوال نہیں تھا، لیکن یہ سوال ہمیشہ رہا کہ یہ کب اور کیسے ہو گا؟"

اگرچہ اِس بارے میں سوال اُٹھائے جاسکتے ہیں کہ برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان کو اِس منزل پر پہنچانے میں کس رفتار سے کام لیا، "لیکن اِس کے ساتھ ہی":

> ہم برطانوی استعداد اور اُن برطانویوں کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے جنھوں نے ایک صدی سے زیادہ اپنی بہترین سمجھ کے مطابق ہند پر حکومت کی اور زندگی کے بہت سے شعبوں میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں، خاص طور پر عدلیہ

کے نظام پر جو عوام کے حقوق اور آزادیوں کے لیے سب سے بڑی پناہ اور محافظ رہا ہے۔

جناح نے کہا کہ "شاہ جارج ششم کا زمانہ تاریخ میں رضاکارانہ طور پر اقتدار منتقل کرنے کے اِس فعل کے لیے یاد رکھا جائے گا" کیونکہ:

ایک قوم کی طرف سے اقتدار کو یوں مکمل طور پر کسی دوسری قوم کے سپرد کرنے کی کوئی اور مثال پوری دنیا کی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ یہ دولتِ مشترکہ کے عظیم نصب العین کا حصول اور تکمیل ہے جو اَب ہوئی ہے۔[1]

اگلی صبح ۱۴/ اگست کو، جب اسلامی کیلنڈر کے لحاظ سے ۲۶/ رمضان تھی، اور جمعرات کا دن تھا، دستور ساز اسمبلی میں انتقالِ اقتدار کی تقریب ہُوئی۔

وائسرائے نے شاہ جارج ششم کا پیغام پڑھ کر سنایا، جس میں پاکستانی قوم سے کہا گیا تھا، "آپ نے باہمی رضامندی کے ذریعے آزادی حاصل کر کے دنیا کی تمام آزادی پسند اقوام کے لیے ایک مثال قائم کی ہے۔"

اپنی تقریر میں وائسرائے نے کہا، "ہم دوستوں کی طرح جُدا ہو رہے ہیں جنھوں نے اختلافات کے باوجود بھی ایک دوسرے کی عزت اور احترام کرنا سیکھا ہے۔"

قائداعظم نے بھی اپنی جوابی تقریر میں کہا، "جی ہاں، ہم دوستوں کی طرح جدا ہو رہے ہیں اور مجھے دل سے اُمید ہے کہ ہم دوست رہیں گے۔"[2]

اگرچہ پاکستان کے وجود میں آنے کی تاریخ اگلے دن یعنی ۱۵/ اگست تھی، اور اگلے دن ہی قائداعظم نے گورنر جنرل اور لیاقت نے وزیراعظم کے حلف بھی اٹھائے، لیکن بعد میں طے ہوا کہ آزادی کی سالگرہ ۱۴/ اگست کو منائی جائے کیونکہ انتقال اُس دن منتقل ہوا تھا۔

---

[1] Yusufi, *op. cit.,* pp.2606-2608

[2] Constituent Assembly of Pakistan, *op. cit.,* pp.51, 52

*

اُس رات پاکستان اور بھارت دونوں میں خوشیاں منائی گئیں۔

رات کے ٹھیک بارہ بجے، جب ۱۴/ اگست ختم اور ۱۵/ اگست شروع ہوئی، تو پاکستان اور بھارت وجود میں آ گئے۔ پاکستان کے ریڈیو اسٹیشنوں نے، جو ہمیشہ اپنے "آل انڈیا ریڈیو" ہونے کا اعلان کرتے تھے، اب "یہ ریڈیو پاکستان ہے" کے الفاظ نشر کیے، اور قومی نغمے بجائے (اُن نشریات کی کوئی ریکارڈنگ موجود نہیں ہے۔ ایک ریکارڈنگ جو عام طور پر مشہور ہے، وہ پچاس برس بعد تیار کی گئی نقل ہے، جس میں غلط تاریخ بیان کی گئی ہے)۔

دُوسری طرف نئی دہلی میں آدھی رات سے کافی پہلے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہو چکا تھا۔ اُس کے آغاز میں بندے ماترم کا پہلا مصرعہ ترانے کے طور پر گایا گیا تھا۔ نہرو نے قرارداد پیش کی تھی کہ رات بارہ بجے تمام ارکان ریاستِ ہندوستان کے ساتھ وفاداری کا حلف اُٹھائیں۔ انہوں نے کہا تھا:

> کئی برس قبل ہم نے تقدیر سے وعدۂ ملاقات کا عہد کیا تھا اور اب وہ وقت آ گیا ہے جب ہمیں اس کا پھل ملنے والا ہے، مکمل نہیں بلکہ کافی اور وافر مقدار میں۔ رات کے اس نصف پہر میں جب کہ پوری دنیا سو رہی ہے، بھارت ایک نئی زندگی اور آزادی کی صبح میں سانس لے گا۔

مسلم لیگی رہنما چودھری خلیق الزماں نے بھی صاف اور واضح الفاظ میں اِس قرارداد کی تائید کی کہ ریاستِ ہندوستان کے ساتھ وفاداری کا حلف اُٹھایا جائے۔

رات بارہ بجے اسمبلی کے تمام ممبروں نے ریاستِ ہندوستان کے ساتھ وفاداری کا حلف اُٹھایا۔ آخر میں اقبال کے "ترانۂ ہندی" کے کچھ اشعار پڑھے گئے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اِس کی یہ گلستاں ہمارا

اُس کے بعد ٹیگور کے ترانے ”جنا گنا منا“ کا پہلا مصرعہ پڑھا گیا کہ عوام کے ذہنوں پر حکومت کرنے والے، تیری جیت ہو: ”جنا گنا منا ادھی نایک جے ہے!“ (کچھ عرصے بعد اِسے سرکاری طور پر بھارت کا قومی ترانہ بنالیا گیا)۔

اقبال نے جاویدنامہ میں دکھایا تھا کہ ہندوستان کے آزاد ہونے کے لمحے ایک فرشتے کی نظر ہندوستان پر جمی ہوئی ہے۔ اُسی کتاب میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ قرآن کے باطن میں ایسی دنیائیں موجود ہیں جو ابھی تک ظاہر نہیں ہوئی ہیں اور اُنہی میں سے ایک دنیا بتدریج ظاہر ہو رہی ہے۔

اب ہندُوستان کو آزادی مل چکی تھی۔ اور پاکستان بھی وجود میں آ چکا تھا (اُس علاقے سمیت جو اَب بنگلہ دیش کہلاتا ہے)۔

اگر یہ وہی دنیا تھی جو اقبال کے مطابق قرآن کے باطن میں سے برآمد ہوئی، تو اُس نے اپنے ظہور کے لیے وہی تاریخ منتخب کی جب قرآن نازل ہُوا تھا۔ وہ رمضان کی ستائیسویں رات تھی، جسے مسلمان ”شبِ قدر“ کہتے ہیں:

”بیشک ہم نے اِسے شبِ قدر میں نازل کیا
اور تمہیں کیا معلوم کہ شبِ قدر کیا ہے!
شبِ قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے۔
اس میں فرشتے اُترتے ہیں اور روح؛ اپنے پروردگار کی اجازت سے ہر اَمر کے لیے۔
سلامتی ہے یہ طلوعِ سحر تک!“[1]

---

[1] بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ۝ وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ۝ لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ۬ۙ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَہۡرٍ ۝ تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوۡحُ فِیۡہَا بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ ۚ مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ ۝ سَلٰمٌ ۟ۛ ہِیَ حَتّٰی مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ۝

ضمیمے

ا۔ ایک اعتراض کا جواب

جو لوگ غلامانہ ذہنیت میں پختہ ہو چکے ہوں وہ اپنی آزادی کی قدر نہیں کر سکتے۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں مسلمانوں نے دوہری غلامی کے تحت زندگی بسر کی تھی اور اُس کا اثر تعلیم یافتہ طبقے پر سب سے زیادہ تھا۔ اِس لیے آزادی کے بعد عوام نے تو غلامانہ ذہنیت سے نجات حاصل کر لی ہے لیکن ہمارے دانشوروں میں ابھی تک غلامانہ ذہنیت سے پیدا ہونے والی علمی روایات چلی آ رہی ہیں۔ اُنہی میں سے ایک روایت پاکستان کے قیام پر اعتراض کرنے کی روایت ہے۔

ہمیں سب سے پہلے یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جو شخص کسی ریاست کا شہری ہو اُس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اُس ریاست کی بنیاد کو درست تسلیم کرتا ہو۔ کیونکہ جب بھی ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں ریاست غلط بنیادوں پر قائم ہوئی ہے یا اُس کا قائم نہ ہونا زیادہ بہتر تھا تو درحقیقت ہم یہی کہہ رہے ہوتے ہیں کہ اُس ریاست کو ختم ہو جانا چاہیے۔ اِس لیے جو لوگ بھی پاکستان کے وجود پر کسی بھی قسم کا اعتراض کرتے ہیں وہ شعوری نہیں تو لاشعوری طور پر ضرور پاکستان کے خاتمے کے خواہشمند ہوتے ہیں خواہ اُنہیں خود اِس بات کا احساس نہ ہو۔

اِس لیے اُنہیں اُن کے اعتراضات کے جواب دے کر قائل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اُن کے ایک اعتراض کا جواب دیا جائے گا تو وہ مزید تین اعتراضات کھڑے کر دیں گے۔ اِس لیے بہتر یہی ہے کہ جو وقت اُن کے اعتراض کا جواب دینے میں صرف ہونے والا ہے

اُسے پاکستان کی تعمیر اور ترقی کے لیے عملی اقدامات کرنے میں لگایا جائے۔

اِس لیے یہاں پاکستان کے قیام کے خلاف اٹھائے جانے والے تمام اعتراضات کے جواب نہیں دیئے جا رہے۔ صرف مثال کے طور پر ایک اعتراض کا جواب پیش کیا جا رہا ہے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ کس طرح کسی ایک ہی اعتراض میں کئی طرح کے ذہنی مغالطے چھپے ہوئے ہو سکتے ہیں۔

آج کل بعض عجیب و غریب قسم کے لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض کچھ زیادہ سننے میں آ رہا ہے کہ اگر برصغیر تقسیم نہ ہوتا تو متحدہ ہندوستان میں مسلمان ایک متحدہ قوّت کے طور پر اپنے آپ کو زیادہ وسیع پیمانے پر منظم کر سکتے تھے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کا فیصلہ ایک انتخابی عمل کے ذریعے مسلمانوں کی اِتنی بھاری اکثریت نے کیا تھا کہ اُسے ایک قوم کا متفقہ فیصلہ کہنا بالکل درست ہو گا۔ اِس لیے اگر کوئی سمجھتا ہے کہ کسی بھی وجہ سے وہ فیصلہ غلط تھا تو اُسے سب سے پہلے جمہوریت کو مسترد کرنا پڑے گا اور کہنا پڑے گا کہ جمہوریت کے بجائے کوئی اور نظام قائم ہونا چاہیے۔ اِس لیے جو لوگ بھی اپنے لیے کسی نہ کسی قسم کے جمہوری حقوق چاہتے ہیں اُن کی طرف سے تو یہ اعتراض قبول ہی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اعتراض تو صرف ڈکٹیٹر شپ کے حق میں ایک دلیل کے طور پر ہی پیش کیا جا سکتا ہے کہ "دیکھو! مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے خود ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی!"

اُس صورت میں بھی یہ اعتراض درست نہ ہو گا۔ وجہ اِس کتاب میں آپ کے سامنے آ چکی ہے۔ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام سے لے کر ۱۹۳۷ء کے انتخابات تک مسلمان اِسی بات کی کوشش تو کرتے رہے تھے کہ ایک متحدہ ہندوستان میں اپنے آپ کو منظم کریں! لیکن آپ دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۳۷ء میں کانگرس نے صاف اور واضح الفاظ میں

کہہ دیا کہ مسلمانوں کو کسی بھی صورت میں اپنے آپ کو منظم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور اُنہیں کانگرس میں ضم ہونا پڑے گا۔ یہاں تک کہ آئین میں مسلمانوں کو اپنے آپ کو منظم کرنے کے لیے جو دفعات تیس برس کی مسلسل جدوجہد کے ذریعے شامل کروائی گئی تھیں اُنہیں بھی کانگرس نے نظر انداز کر دیا۔ پورے برصغیر میں کوئی بھی نہ تھا جو کانگرس اور ہندو قیادت کو روک سکتا۔

اِن تاریخی حقائق کی روشنی میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کہنا کتنی بڑی علمی بددیانتی ہے کہ ایک متحدہ برصغیر میں مسلمان اپنے آپ کو زیادہ بہتر طور پر منظم کر سکتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد پورے برصغیر کے مسلمانوں کے پاس اپنے آپ کو منظم کرنے کی قوّت پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی بشرطیکہ وہ اُسی بنیاد پر قائم رہتے تھے جس بنیاد نے اُنہیں منظم کیا تھا۔ وہ بنیاد آل انڈیا مسلم لیگ تھی۔ پاکستان کے قیام کے بعد اُس قومی تنظیم کو دو علیحدہ تنظیموں میں اِسی لیے تقسیم کیا گیا تھا کہ ایک تنظیم بھارت میں سرگرمِ عمل ہو اور دوسری پاکستان کی قیادت سنبھالے۔ لیکن دونوں کا ورثہ اور سیاسی تدبر مشترک ہو۔

برصغیر کے مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ گواہ ہے کہ پورے برصغیر کے مسلمان اگر کبھی متحد ہوئے تو صرف تحریکِ پاکستان کے دوران آل انڈیا مسلم لیگ کے ذریعے! ورنہ اُس سے پہلے محمد بن قاسم سے لے کر سلطان ٹیپو کے عہد تک کبھی بھی برصغیر کے تمام مسلمان ایک سیاسی وحدت نہ بنے تھے۔ آج بھی اگر کوئی شخص برصغیر کے مسلمانوں کا اتحاد چاہتا ہے تو اُس کی صرف یہی صورت ہے کہ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے مسلمان اپنی اپنی ریاستوں کے وفادار رہتے ہوئے اُس جماعت کے ورثے کو دوبارہ زندہ کر دیں جس نے اُنہیں متحد کیا تھا:

اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو اور آپس میں تفرقہ مت ڈالو۔ اوراللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، پس اس کے فضل سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکے تھے تو اُس نے تمہیں اُس سے بچالیا۔ اللہ تم سے یوں ہی اپنی نشانیاں بیان فرماتا ہے تا کہ تم ہدایت پا جاؤ(سورہ آلِ عمران، آیت ۱۰۳)۔

۲۔ قراردادِ دہلی، ۸/ اپریل ۱۹۴۶ء

۱۹۴۶ء میں دہلی میں مسلم لیگ لیجسلیٹرز کنونشن نے ۸/ اپریل کو ایک قرارداد پیش کی اور آدھی رات کے بعد اُسے متفقہ طور پر منظور کیا۔ اُس اجلاس کا حال آٹھویں باب، "عہدِ وفا"، میں دیکھا جا سکتا ہے۔ قرارداد کی اہمیت کی وجہ سے اُس کے مکمل متن کا ترجمہ یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔

جبکہ ہندوستان کے اِس وسیع برِ صغیر میں دس کروڑ مسلمان ایک ایسے عقیدے کے پیرو ہیں جو اُن کی زندگی کے ہر شعبے (تعلیمی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی) میں نافذ ہے، جس کا ضابطہ محض روحانی تعلیمات اور عقائد، اور رسومات و تقریبات تک محدود نہیں ہے، اور جو ہندو دھرم اور فلسفے کی اُس امتیازی نوعیت سے ٹکراتا ہے جس نے ہزاروں سال سے ذات پات کے ایک منجمد نظام کو پروان چڑھا کر چھ کروڑ انسانوں کو اَچھوت بنا دیا ہے، جس نے انسان اور انسان کے درمیان غیر فطری دیواریں کھڑی کی ہیں، اور جس کی وجہ سے مسلمان، عیسائی اور دوسری اقلیتیں سماجی اور

اقتصادی طور پر دائمی غلامی کے خطرے سے دوچار ہیں؛

جبکہ ذات پات کا ہندو نظام قومیت، مساوات، جمہوریت اور اُن تمام بلند مقاصد کی کھلی خلاف ورزی ہے جن کی اسلام نمایندگی کرتا ہے؛

جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مختلف تاریخی پس منظر، روایات، ثقافت، اور سماجی اور اقتصادی نظاموں کی وجہ سے ناممکن ہے کہ ایک واحد ہندوستانی قوم ارتقا پاسکے جس کے ارمان اور نصبُ العین مشترک ہوں، اور صدیوں بعد بھی وہ ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف دو قومیں ہیں؛

جبکہ ہندوستان میں مغربی جمہوریت کی طرز کے سیاسی ادارے متعارف کروانے کی برطانوی پالیسی کے نفاذ کے بعد جلد ہی واضح ہو گیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم یا معاشرے کی اکثریت دوسری قوم یا معاشرے کی اکثریت پر اُس کی مرضی کے خلاف حکومت کرے گی، جیسا کہ 1935 کے دستورِ ہند کے تحت ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگرس کی حکومت کے ڈھائی سال میں کُھل کر سامنے آ گیا جب مسلمانوں کو ناگفتہ ہراس اور ظلم کا نشانہ بنایا گیا، جس کے بعد وہ دستور میں فراہم کیے ہوئے نام نہاد تحفظات اور گورنروں کو دی ہوئی ہدایات کے بے اثر ہونے کے قائل ہو کر اِس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوئے کہ اگر ایک متحدہ ہندوستانی وفاق قائم ہوا تو مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کی حالت کچھ بہتر نہ ہو گی، اور اُن کے حقوق اور مفادات مرکز کی مستقل ہندو اکثریت کے ہاتھوں محفوظ نہ رہیں گے؛

جبکہ مسلمانوں کو یقین ہے کہ مسلم ہندوستان کو ہندوؤں کے تسلط سے بچانے اور مسلمانوں کو اپنی قدرتی صلاحیتوں کے مطابق خود کو ترقی دینے کے مواقع فراہم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ شمال مشرقی حصے میں بنگال اور آسام، اور شمال

مغربی حصے میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل خود مختار ریاست قائم کی جائے؛

ہندوستان کے مرکزی اور صوبائی مسلم لیگی قانون سازوں کا یہ کنونشن گہرے غور وخوص کے بعد اعلان کرتا ہے کہ مسلم قوم کبھی ایک متحدہ ہندوستان کے لیے آئین قبول نہ کرے گی اور کبھی اس مقصد کے لیے بننے والے واحد دستور ساز ادارے میں شریک نہ ہو گی، اور ہندوستان کے عوام کو اقتدار منتقل کرنے کے لیے برطانوی حکومت کا کوئی فارمولا ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے میں مفید نہ ہو گا اگر وہ مندرجہ ذیل اصولوں کے مطابق نہ ہوا جو انصاف پر مبنی ہیں اور ملک میں داخلی امن و سکون قائم رکھنے والے ہیں:

- کہ بنگال اور آسام پر مبنی شمال مشرقی حصہ اور پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مبنی شمال مغربی حصہ، یعنی پاکستانی حصے، جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، ایک آزاد خود مختار ریاست بنایا جائے اور کسی تاخیر کے بغیر پاکستان کے قیام پر عمل درآمد کرنے کا حتمی وعدہ کیا جائے؛
- کہ پاکستان اور ہندوستان کے عوام اپنے اپنے آئین کی تشکیل کے لیے دو علیحدہ دستور ساز ادارے قائم کریں؛
- کہ پاکستان اور ہندوستان میں اقلیتوں کو آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں منظور کی ہوئی قرارداد کے مطابق تحفظات فراہم کیے جائیں؛[1]

[1] قراردادِ لاہور میں کہا گیا تھا کہ مسلم اور غیر مسلم علاقوں میں اقلیتوں کے تمام حقوق ''اُن کے ساتھ مشاورت کے ذریعے طے کیے جائیں۔''

- کہ مرکزی میں عبوری حکومت کی تشکیل میں مسلم لیگ کے تعاون اور شمولیت کی بنیادی شرط مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی قبولیت اور اس پر بلا تاخیر عمل درآمد ہے؛

مزید برآں یہ کنونشن پرزور اعلان کرتا ہے کہ متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر کسی آئین کو نافذ کرنے یا مسلم لیگ کے مطالبے کے برعکس مرکز میں کوئی عبوری بندوبست نافذ کرنے کی کوئی بھی کوشش مسلمانوں کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہ چھوڑے گی کہ اپنی بقا اور قومی وجود کی خاطر ہر ممکن طریقے سے اس کی مزاحمت کریں۔

۳۔ مسلمانوں کا حلف، ۸/ اپریل ۱۹۴۶ء

مسلم لیگ لیجسلٹرز کنونشن کے موقع پر جو حلف تمام نمایندوں نے اُٹھایا، اور جو بعد میں قائداعظم نے برصغیر کے تمام مسلمانوں کو بھی اُٹھانے کی تاکید کی، اُس کا ذکر بھی آٹھویں باب، ''عہدِ وفا'' میں آچکا ہے۔ حلف کا مکمل متن یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''کہہ دیجیے کہ میری عبادت اور قربانی، اور میرا جینا اور مرنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے'' (قرآن)

میں اپنے اِس پختہ عقیدے کا باقاعدہ اعلان کرتا / کرتی ہوں کہ ہندوستان کے اِس برصغیر میں آباد ملتِ اسلامیہ کا تحفظ اور سلامتی، اور نجات اور تقدیر صرف پاکستان کے حصول پر موقوف ہے، جو دستوری مسئلے کا واحد منصفانہ، عزت دارانہ اور عادلانہ حل ہے، اور جو اِس عظیم برصغیر کی مختلف قوموں اور ملّتوں کے لیے امن، آزادی اور خوشحالی لائے گا؛

میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اقرار کرتا/کرتی ہوں کہ پاکستان کے عزیز قومی نصبُ العین کے حصول کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے شروع کی جانے والی کسی بھی تحریک پر عمل درآمد کے لیے اُس کی طرف سے جاری ہونے والے تمام احکامات اور ہدایات کی دلی رضامندی اور استقامت کے ساتھ اطاعت کروں گا/گی، اور چونکہ مجھے اپنے مقصد کے حق و انصاف پر مبنی ہونے کا یقین ہے، میں ہر اُس خطرے، امتحان یا قربانی سے گزرنے کا حلف اٹھاتا/اٹھاتی ہوں جس کا مجھ سے تقاضا کیا جائے۔

"اے ہمارے رب! ہمیں صبر عطا فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کفار کی قوم کے خلاف ہماری مدد فرما!" (قرآن)۔ آمین!

۴۔ قائداعظم کے کچھ خاص اقوال

۱۹۳۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا انتخابی منشور جاری کرنے سے ۱۹۴۸ء میں وفات پانے تک قائداعظم نے اپنے ہر عام خطاب میں یہی کہا کہ سب سے پہلے غربت دُور کرنے کے لیے عملی اقدامات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ان میں سے بعض اہم ترین مواقع سے اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں۔

مَیں ہر صوبے، ہر ضلع، ہر تحصیل، ہر شہر میں ہندوستان کے مسلمانوں سے کہتا ہوں، آپ کا اولین فرض عوام کی فلاح کا ایک تعمیری اور رفاہی لائحۂ عمل بنانا اور مسلمانوں کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی بہتری کے لیے طریقے اور ذرائع تلاش کرنا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے پچیسویں اجلاس کا خطبۂ صدارت، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۳۷ء

ہمیں، موجودہ حالات میں، اپنے لوگوں کو منظم کرنا ہے، مسلم عوام کو ایک بہتر دنیا کے لیے

اور اُن کی حالت کو فوری طور پر بہتر بنانے کے لیے تقویت دینی ہے، اور ہمیں تعمیری اور فلاحی نوعیت کے منصوبے بنانے ہیں جو اُنہیں اُس غربت اور افلاس سے فوری طور پر نجات دلائیں جس کے ہاتھوں وہ ہندوستان کے کسی اور حصے سے زیادہ تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے خصوصی اجلاس کا خطبۂ صدارت، کلکتہ، اپریل ۱۹۳۸ء

میں کہہ سکتا ہوں کہ اب مسلم لیگ کسی کی رفاقت کے لیے تیار نہیں ہے لیکن اگر مسلمانوں کے مفاد کا معاملہ ہو تو وہ ابلیس کی بھی حلیف بن جائے گی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے چھبیسویں اجلاس کا خطبۂ صدارت، پٹنہ، دسمبر ۱۹۳۸ء

میرا خیال ہے کہ عوام پوری طرح بیدار ہو چکے ہیں۔ انہیں صرف آپ سے رہنمائی اور قیادت کی ضرورت ہے۔ اسلام کے خادم بن کر آگے آیئے، عوام کو اقتصادی، سماجی، تعلیمی اور سیاسی طور پر منظم کیجیے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں اجلاس کا خطبۂ صدارت، لاہور، مارچ ۱۹۴۰ء

اب اِس کے بعد کیا؟... مسلم ہند کی قومی زندگی کے شعبوں کی تعمیر کیجیے۔ یہ شعبے چہار گانہ ہیں [اقتصادی، سماجی، تعلیمی اور سیاسی] اور تعمیر کے چار ستونوں کا کام دیتے ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اٹھائیسویں اجلاس کا خطبۂ صدارت، مدراس ۱۴/اپریل ۱۹۴۱ء

میں آپ میں سے ہر ایک سے اپیل کرتا ہوں کہ مہربانی کر کے میری اُس تقریر کو بار بار پڑھیے، اور اُس کا مطالعہ کیجیے — نہ صرف مطالعہ کیجیے بلکہ میں آپ میں سے ہر ایک سے اپیل کرتا ہوں کہ ہم نے جو پروگرام اور پالیسی وضع کی ہے، آپ میں سے ہر ایک اُس کے لیے کسی نہ کسی رُخ میں کچھ نہ کچھ آغاز کر دے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے انتیسویں اجلاس کا خطبۂ صدارت، الٰہ آباد، اپریل ۱۹۴۲ء

یہاں میں جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کو ایک تنبیہ کرنا چاہوں گا جو ہمیں نقصان پہنچا کر ایک ایسے نظام کی بدولت پنپتے رہے ہیں جو اِتنا بے رحم ہے، جو خبیث ہے، اور جو اُنہیں اتنا خود غرض بناتا ہے کہ اُنہیں کچھ سمجھانا مشکل ہے۔ عوام کا استحصال اُن کے لہو میں رچ بس گیا ہے۔ وہ اسلام کا پیغام بھول گئے ہیں... لاکھوں کی تعداد میں ہمارے لوگ ہیں جنہیں مشکل سے دن میں ایک وقت کا کھانا ملتا ہے۔ کیا یہ تہذیب ہے؟ کیا یہ پاکستان کا مقصد ہے؟ کیا آپ اپنے تصوّر میں لاسکتے ہیں کہ لاکھوں لوگوں کا استحصال ہوتا رہا ہے اور دن میں ایک وقت کا کھانا نہیں ملتا! اگر پاکستان کا مطلب یہی ہے تو مجھے ایسا پاکستان نہیں چاہیے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے تیسویں اجلاس کا خطبۂ صدارت، دہلی، ۲۴/اپریل ۱۹۴۳ء

سب سے پہلے آپ کو پوری سنجیدگی کے ساتھ ہمارے عوام کی اقتصادی، سماجی، تعلیمی اور سیاسی بہتری کے لیے ایک تعمیری پروگرام شروع کر دینا چاہیے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اکتیسویں اجلاس کا خطبۂ صدارت، کراچی، ۲۴/دسمبر ۱۹۴۳ء

ہمیں پوری طرح اور یکسوئی کے ساتھ اپنی توجہ لوگوں کی، اور خاص طور پر عوام اور غریبوں کی، بہبود پر دینی چاہیے۔

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی، کراچی، ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء

ایک نئی ریاست کے قیام نے پاکستان کے شہریوں کو موقع فراہم کیا ہے کہ وہ دنیا کو دکھائیں کہ کس طرح ایک قوم، جو مختلف عناصر پر مشتمل ہو، امن اور محبت کے ساتھ رہ سکتی ہے اور ذات یا مذہب کی تفریق کے بغیر اپنے تمام شہریوں کی بہتری کے لیے کام کر سکتی ہے۔

قوم سے خطاب، ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء

ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ صرف ہر طرح کی محرومی اور خوف ہی کو ختم نہ کیا جائے بلکہ آزادی، اخوت اور مساوات بھی حاصل کی جائے جس کا حکم ہمیں اسلام نے دیا ہے۔

کراچی میونسپل کارپوریشن کے سپاسنامے کا جواب، ۲۷/ اگست ۱۹۴۷ء

اپنے لیے ایک ریاست قائم کرنا محض مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا اور مقصد نہ تھا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ ہماری ایک ایسی ریاست ہو جہاں... اسلام کے سماجی انصاف کے اصول عام ہو سکیں۔

خالقدینا ہال کراچی میں افسران سے خطاب، ۱۱/ اکتوبر ۱۹۴۷ء

ریاست صرف زندگی کے لیے نہیں بہتر زندگی کے لیے وجود رکھتی ہے۔

عیدُ الاضحیٰ کے موقع پر قوم کے نام پیغام، ۲۴/ اکتوبر ۱۹۴۷ء

اب آپ کو اپنے وطن کی زمین پر اسلامی جمہوریت، اسلامی معاشرتی انصاف اور انسان کی برابری کی حفاظت کرنی ہے۔

ملیر میں فوجی رجمنٹوں سے خطاب، ۲۱/ فروری ۱۹۴۸ء

آپ میرے ہی جذبات اور کروڑوں مسلمانوں کے جذبات بیان کر رہے ہیں جب آپ کہتے ہیں کہ پاکستان کو سماجی انصاف کی مضبوط بنیادوں اور اسلامی سوشلزم پر– کسی اور ''اِزم'' پر نہیں– قائم ہونا چاہیے، جو اِنسان کی برابری اور اُخوّت پر زور دیتا ہے... ہم نے اِسی غرض سے پاکستان کا مطالبہ کیا، اس کے لیے جدوجہد کی اور اسے حاصل کیا...

چٹاگانگ، ۲۶/ مارچ ۱۹۴۸ء

مغرب کا اقتصادی نظام... انسان اور انسان کے درمیان انصاف قائم کرنے میں اور بین

الاقوامی طور پر بھی چپقلش دُور کرنے میں ناکام رہا ہے... ہمارا ایک خوش اور مطمئن قوم بنانے کا مقصد مغرب کے اقتصادی نظریے اور عمل کی پیروی کر کے پورا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنی تقدیر اپنے طور پر بنانی چاہیے اور دنیا کے سامنے انسان کی برابری اور سماجی انصاف کے سچے اسلامی تصوّر پر مبنی ایک اقتصادی نظام پیش کرنا چاہیے۔

اسٹیٹ بینک کا افتتاح، کراچی، یکم جولائی ۱۹۴۸ء

۵۔ محمڈن ایجو کیشنل کانفرنس کے پہلے بیس سال

سال	مقام	صدر
۱۸۸۶	علیگڑھ	مولوی حاجی محمد سمیع اللہ خاں رئیس دہلی
۱۸۸۷	لکھنؤ	منشی امتیاز علی خاں رئیس کاکوری
۱۸۸۸	لاہور	خان بہادر سردار محمد حیات خاں
۱۸۸۹	علیگڑھ	حیات خاں (غیر حاضر؛ خان بہادر محمد برکت علی خاں قائم مقام)
۱۸۹۰	الٰہ آباد	خان بہادر سردار محمد حیات خاں
۱۸۹۱	علیگڑھ	خان بہادر سید امیر حسین سی آئی ای (غیر حاضر؛ نواب حاجی محمد اسحٰق خاں قائم مقام)
۱۸۹۲	دہلی	مولوی حشمت اللہ ایم اے، آئی سی ایس
۱۸۹۳	علیگڑھ	مہدی علی خاں نواب محسن الملک
۱۸۹۴	علیگڑھ	خان بہادر جسٹس میاں محمد شاہ دین
۱۸۹۵	شاہجہانپور	حیات خاں (غیر حاضر؛ محسن الملک مقام)

سال	مقام	صدر
۱۸۹۶	میرٹھ	حیات خاں (غیر حاضر؛سید حسین بلگرامی قائم مقام)
۱۸۹۷	طاعون کی وجہ سے اجلاس نہ ہو سکا	
۱۸۹۸	لاہور	نواب حاجی فتح علی خاں قزلباش سی آئی ای رئیس لاہور
۱۸۹۹	کلکتہ	جسٹس سید امیر علی ایم اے سی آئی ای
۱۹۰۰	رام پور	نواب علی یار خاں بہادر مؤتمن جنگ عماد الدولہ عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی
۱۹۰۱	مدراس	چیف جسٹس باڈم
۱۹۰۲	دہلی	سر آغا خاں سوئم
۱۹۰۳	بمبئی	جسٹس بدرالدین طیب جی رئیسِ بمبئی
۱۹۰۴	لکھنؤ	تھیوڈور ماریسن
۱۹۰۵	علیگڑھ	مشیر الدولہ ممتاز الملک خان بہادر خلیفہ سید محمد حسین
۱۹۰۶	ڈھاکہ	جسٹس سید شرف الدین

۶۔ مسلم لیگ کے اجلاس

نوعیت	سال	مقام	صدر
افتتاحی	۱۹۰۶	ڈھاکہ	مولوی مشتاق علی خاں نواب وقارُ الملک
پہلا	۱۹۰۷	کراچی	آدمجی پیر بھائی
ـــملتوی	۱۹۰۸	علیگڑھ	محمد شاہ دین
دوسرا	۱۹۰۸	امرتسر	سید علی امام

نوعیت	سال	مقام	صدر
تیسرا	۱۹۱۰	دہلی	شہزادۂ ارکاٹ سر غلام محمد علی خاں
چوتھا	۱۹۱۰	ناگپور	سید نبی اللہ
پانچواں	۱۹۱۲	کلکتہ	نواب سلیم اللہ خاں
چھٹا	۱۹۱۳	لکھنؤ	میاں محمد شفیع
ساتواں	۱۹۱۳	آگرہ	ابراہیم رحمت اللہ
آٹھواں	۱۹۱۵	بمبئی	مظہر الحق
نواں	۱۹۱۶	لکھنؤ	محمد علی جناح
دسواں	۱۹۱۷	کلکتہ	مولانا محمد علی [جوہرؔ]: (غیر حاضر بسبب نظر بندی)
خصوصی	۱۹۱۸	بمبئی	راجہ محمود آباد
11واں	۱۹۱۸	دہلی	اے کے فضل الحق
12واں	۱۹۱۹	امرتسر	حکیم اجمل خاں
خصوصی	۱۹۲۰	کلکتہ	محمد علی جناح
13واں	۱۹۲۰	ناگپور	ڈاکٹر مختار احمد انصاری
14واں	۱۹۲۱	احمد آباد	مولانا حسرت موہانی
15واں	۱۹۲۳	لکھنؤ	میر غلام محمد بھرگری
ملتوی	۱۹۲۴	لاہور	محمد علی جناح
16واں	۱۹۲۴	بمبئی	سید رضا علی
17واں	۱۹۲۵	علیگڑھ	عبد الرحیم
18واں	۱۹۲۶	دہلی	شیخ سر عبد القادر

نوعیت	سال	مقام	صدر
19واں	۱۹۲۷	کلکتہ	محمد یعقوب (جناح گروپ)
19واں	۱۹۲۷	لاہور	میاں سر محمد شفیع (شفیع گروپ)
20واں	۱۹۲۸	کلکتہ	راجہ محمود آباد
ــملتوی	۱۹۲۹	دہلی	محمد علی جناح
21واں	۱۹۲۰	الٰہ آباد	ڈاکٹر سر محمد اقبال
22واں	۱۹۳۱	دہلی	چودھری سر ظفر اللہ خاں
23واں	۱۹۳۳	ہورہ	میاں عبد العزیز (عزیز گروپ)
23واں	۱۹۳۳	دہلی	حافظ ہدایت حسین (ہدایت گروپ)
24واں	۱۹۳۶	بمبئی	سید وزیر حسن
25واں	۱۹۳۷	لکھنؤ	محمد علی جناح
خصوصی	۱۹۳۸	کلکتہ	محمد علی جناح
26واں	۱۹۳۸	پٹنہ	محمد علی جناح
27واں	۱۹۴۰	لاہور	محمد علی جناح
28واں	۱۹۴۱	مدراس	محمد علی جناح
29واں	۱۹۴۲	الٰہ آباد	محمد علی جناح
30واں	۱۹۴۳	دہلی	محمد علی جناح
31واں	۱۹۴۳	کراچی	محمد علی جناح

نوعیت	سال	مقام	صدر
تمام اجلاس دسمبر میں ہوئے سوائے ۱۹۰۸ء (مارچ؛ دوسرا سالانہ)، ۱۹۱۰ء (جنوری؛ تیسرا سالانہ)، ۱۹۱۲ء (مارچ)، ۱۹۱۳ء (مارچ؛ چھٹا سالانہ)، ۱۹۱۸ء کا خصوصی اجلاس (اگست-ستمبر)، ۱۹۲۰ء کا خصوصی اجلاس (ستمبر)، ۱۹۲۴ء میں پندرہواں ملتوی اجلاس (مئی)، ۱۹۳۶ء (اپریل)، ۱۹۳۷ء (اکتوبر)، ۱۹۳۸ء کا خصوصی اجلاس (اپریل)، ۱۹۴۰ء (مارچ)، ۱۹۴۱ء (اپریل)، ۱۹۴۲ء (اپریل) اور ۱۹۴۳ء (اپریل)			

حوالے

ابنِ صفی۔ خرّم علی شفیق (ترتیب، تدوین اور حواشی)۔2017۔دانش منزل۔لاہور: یو ایم ٹی پریس

احمد بی اے، نصیر۔ 'اُردو ادب کی اسلامی تحریک'؛طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۳۵، ص ۳۹-۳۲

افضل، محمد رفیق (مرتب)۔1986۔گفتارِ اقبال۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

اقبال، علامہ سر محمد[1]۔[1904]۔علمُ الاقتصاد۔لاہور: کارخانہ پیسہ اخبار

——۔1918۔رموزِ بیخودی۔لاہور [شائع کنندہ: مصنف]

——۔1923۔اسرار و رموز۔لاہور [شائع کنندہ: مصنف]

——۔1930۔بانگِ درا [طبع مکرر]۔لاہور [شائع کنندہ: مصنف]

——۔1932۔جاویدنامہ۔لاہور [شائع کنندہ: مصنف]

——۔1935۔بالِ جبریل۔لاہور [شائع کنندہ: مصنف]

——۔1936۔ضربِ کلیم۔لاہور [شائع کنندہ: مصنف]

——۔1936۔آل انڈیا مسلم لیگ مینی فیسٹو۔ لاہور: مسلم لیگ پنجاب پراونشل پارلیمنٹری بورڈ

بٹالوی، ڈاکٹر عاشق۔2000۔اقبال کے آخری دو سال۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز

برنی، مظفر حسین (مرتب)۔1993۔کلیات مکاتیب اقبال، جلد اول۔ دہلی: اُردو اکادمی

——(مرتب)۔کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم۔ دہلی: اُردو اکادمی

[1] علامہ کی مختلف تصانیف پر مختلف طریقوں سے نام لکھا ہے۔ یہاں سب علامہ سر محمد اقبال کے تحت رکھی گئی ہیں۔

——(مرتب)۔ کلیات مکاتیب اقبال، جلد سوم۔ دہلی: اُردو اکادمی

——(مرتب)۔1998۔ کلیات مکاتیب اقبال، جلد چہارم۔ دہلی: اُردو اکادمی

حالی، مولانا الطاف حسین۔1886۔ مسدس حالی مسمّٰی بہ مدّ و جزرِ اسلام بہ اضافۂ ضمیمۂ نوترتیب و فرہنگ۔ دہلی: مطبع ارمغانِ دہلی

——ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (مرتب)۔1970-1968۔ کلیاتِ نظمِ حالی (دو جلدوں میں)۔ لاہور: مجلس ترقیٔ ادب

حسین، پروفیسر اقبال (مرتب)۔2003۔ دستاویزاتِ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ علیگڑھ: سرسید اکیڈمی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

خاں، سرسید احمد۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (مرتب)۔1992۔ مقالاتِ سرسید (۱۶ جلدوں میں)۔ لاہور: مجلس ترقیٔ ادب

——۔2009۔ خطباتِ سرسید۔ لاہور: مجلس ترقیٔ ادب

ریاض، سید حسن۔1992۔ پاکستان ناگزیر تھا۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ کراچی

رئیس، پروفیسر قمر۔ سید عاشور کاظمی۔۱۹۸۷۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر۔ دہلی: نیا سفر پبلی کیشنز

زبیری مارہروی، مولوی انوار احمد (مرتب)۔ خطباتِ عالیہ یعنی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے چہل سالہ خطباتِ صدارت کا مجموعہ جس میں ہر معزز صدر کے قابلِ مطالعہ و سبق آموز حالاتِ زندگی مع فوٹو کے چھاپے گئے ہیں [دو حصوں میں]۔ علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی پریس

زبیری مارہروی، مولوی محمد امین۔ حیاتِ محسن یعنے سوانح عمری نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں منیر نواز جنگ بہادر علیگڑھ: مسلم یونیورسٹی پریس

——۔1935۔ تذکرۂ محسن یعنی مختصر حالات نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی

خاں بہادر منیرنواز جنگ سابق معتمد سیاسیات و خزانہ مملکت آصفیہ و آنریزی سکرٹری ایم اے او کالج علی گڑھ۔ دہلی: *جامع برقی پریس*

——۔1937۔تذکرۂ وقار یعنی مختصر حالات نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی مشتاق حسین خاں بہادر انتصار جنگ سابق معتمدِ مال گذاری مملکتِ آصفیہ حیدرآباد دکن و بانی آل انڈیا مسلم لیگ و آنریری سکریٹری ایم اے او کالج علی گڑھ۔ *مرادپور پٹنہ: صفیر بُک ڈپو*

——۔1941۔سیاستِ ملّیہ یعنی مسلمانانِ ہند کی سیاست (۱۸۵۷ءتا آغاز ۱۹۴۱ء) کی مکمل و مفصّل تاریخ۔ *آگرہ: عزیزی پریس*

——۔[*تاریخ ندارد*]۔انتخابِ جداگانہ کا تاریخی خلاصہ۔ *آگرہ: عزیزی پریس*

——۔[*تاریخ ندارد*]۔سید محمود۔ *علیگڑھ: مسلم یونیورسٹی پریس*

شاہجہانپوری، ابو سلمان۔1993۔علامہ اقبال اور مولانا محمد علی۔ *کراچی: مکتبہ شاہد*

شبلی نعمانی، شمس العلمائ مولانا۔ [*تاریخ ندارد*]۔ مجموعہ کلامِ شبلی۔ *لاہور: مرغوب ایجنسی*

شفیق، خرّم علی۔2012۔اقبال: درمیانی دَور۔ *لاہور: اقبال اکادمی پاکستان*

علی، مولانا محمد۔ *سید محمد شاہ قادری (مرتب)*۔1998۔مولانا محمد علی جوہر آپ بیتی اور فکری مقالات۔ *لاہور: تخلیقات*

علی، مولوی سید اقبال۔ *شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (مرتب)*۔1991۔سید احمد خاں کا سفرنامۂ پنجاب۔ *لاہور: مجلس ترقیٔ ادب*

Adams, George Burton. 1899. *The Origin and the Results of the Imperial Federation Movement in England.* Madison: State Historical Society of Wisconsin

Afzal, Muhammad Rafique. 2013. *A History of the All-India Muslim League 1906-1947.* Karachi: Oxford University Press

All Parties Conference. 1928. *Report of the Committee appointed by the Conference to determine the principles of the Constitution for India* [also known as the *Nehru Report*]. Allahabad: General Secretary, All India Congress Committee

All Parties National Convention. *The Proceedings of the All Parties National Convention.* Allahabad: Rafi Ahmad Kidwai, Secretary, All Parties National Convention

Anonymous. 1933. *India in 1931-32. A statement prepared for presentation to Parliament in accordance with the requirements of the 26th Section of the Government of India Act (5&6 Geo. V, Chapter 61).* Calcutta: Government of India Central Publication Branch

Balfour, Graham. 1906. *The Life of Robert Louis Stevenson.* London: Methuen & Co

Bamford, P. C. 1925. *Histories of the Non-Co-operation and Khilafat Movements.* Delhi: Government of India Press

Churchill, Winston Spencer. Col. F. Rhodes (ed.). 1899. *The River War. An Historical Account of The Reconquest of the Soudan. In Two Volumes.* London: Longmans, Green & Co

Colonial Conference 1887. 1887. *Proceedings of the Colonial Conference 1887* (Volume I). London: Her Majesty's Sationery Office

Colonial Conference 1907. *Minutes of Proceedings of the Colonial Conference 1907.* London: His Majesty's Sationery Office

Constituent Assembly of Pakistan. *Constituent Assembly of Pakistan Debates Official Report (1947-54).* In 21 volumes. Karachi: Govt. of Pakistan

Das, C. R. 1921. *India for Indians.* Madras: Ganesh & Co.

—. 1922. *Freedom Through Disobedience.* Madras: Arka Publishing House

Dayanand Saraswati, Maharshi Swami. Durga Prasad (tr.). 1903. *An English Translation of the Satyarth Prakash.* Lahore: Virjanand Press

—. Dr Chiranjiva Bharadwaja (tr.). 1915. *Light of Truth or an English Translation of the Satyarth Prakash.* United Provinces of Agra and Oudh: The Arva Pratinidhi Sabha

Desai, Ashwin & Goolam Vahed. 2016. *The South African Gandhi: Stretcher-Bearer of Empire.* California: Stanford University Press

Dil, Anwar & Afia Dil. 'Iqbal and the Muslim Renaissance in Bengal'. *Iqbal Review,* April 2009, pp.113-140

Follett, Mary Parker. 1918. *The New State.* New York: Longmans, Green & Co.

Gandhi, M K. 1999. *Collected Works of Mahatma Gandhi (Electronic Book)*. New Delhi: Publications Division, Government of India, 98 volumes

Gwyer, Sir Maurice & A. Appadorai (ed.). 1957. *Speeches and Documents on the Indian Constitution 1921-1947.* (In two volumes). Bombay: Oxford University Press

Hall, H. Duncan. 1920. *The British Commonwealth of Nations; a study of its past and future development.* London: Methuen & Co. Ltd.

[INC] Indian National Congress. [*n.d.*]. *Proceedings of the First Indian National Congress. Held at Bombay, on the 28th, 29th and 30th December, 1885.* [Publisher not mentioned]

—. 1905. *Report of the Twentieth Indian National Congress held at Bombay, on the 26th, 27th and 28th December 1904.* Bombay: Crown Printing Works

—. 1915. *Report of the Proceedings of the Twenty-Ninth Indian National Congress held at Madras on the 28th, 29th and 30th December 1914.* Madras: Thompson & Co.

—. [*n.d.*]. *Report of the Thirty-Fifth Session of the Indian National Congress held at Nagpur on the 26th, 28th, 30th and 31st December 1920.* Nagpur: Dr B S Moonje

—. 1923. *Report of the Thirty-Seventh Indian National Congress held at Gaya on the 26th, 27th, 29th, 30th and 31st December, 1922.* Patna: Central Printing Press

— 1928 (b) *Report of the Forty-Second Indian National Congress. Held at Madras 1927.* Madras: The Reception Committee The Forty-Second Indian National Congress

Indian Statutory Commission. 1930. *Report of the Indian Statutory Commission.* (in 16 volumes). London: His Majesty's Stationery Office

Iqbal, Dr. Sir Muhammad.[1] 1930. *All-India Muslim League, Allahabad Session, December—1930, Presidential Address.* Lahore [self-published]

—. 1934. *The Reconstruction of Religious Thought in Islam.* London: Oxford University Press

Iqbal, Afzal (ed.). 1963. *Select Writings and Speeches of Maulana Mohamed Ali.* (In two volumes). Lahore: Sh. Muhammad Ashraf

Name has been standardized in this bibliography. [1]

[IRTC] Indian Round Table Conference. 1931. *Proceedings.* Calcutta: Government of India Central Publication Branch

—. 1931. *Proceedings of Sub-Committees*. Volume 3—Sub-Committee No.3 (Minorities). Calcutta: Government of India Central Publication Branch

[IRTC2] Indian Round Table Conference (Second Session). 1932. *Proceedings.* London: His Majesty's Stationery Office

—. Indian Round Table Conference (Second Session). 1932. *Proceedings of Federal Structure Committee and Minorities Committee.* London: His Majesty's Stationery Office

[IRTC3] Indian Round Table Conference. 1933. *Indian Round Table Conference (Third Session) November-December 1932. Sub-Committees; Reports; Summaries of Discussions and the Secretary of State's Statement.* Calcutta: Government of India Central Publication Branch

Jinnah, M. A. [n.d.] *Mahomed Ali Jinnah An Ambassador of Unity: his speeches & writings 1912-1917 with a biographical appreciation by Sarojini Naidu and a foreword by the Hon'ble the Rajah of Mahmudabad.* Madras: Ganesh & Co.

—. (ed.). [*n.d.*]. *Iqbal to Jinnah. A collection of Iqbal's letters to the Qaid-i-Azam conveying his views on the political future of Muslim India.* Lahore: Sh. Muhammad Ashraf

Jordens, J T F. 1960. *Dayananda Sarasvati, His Life and Ideas.* Delhi: Oxford University Press

Karim, Saleena. 2017. *Secular Jinnah & Pakistan. What the Nation Doesn't Know (revised & enlarged edition).* Nottingham: Libredux Publishing

Keith, Professor A. Berriedale (ed.). [*n.d.*]. *Speeches & Documents on Indian Policy* 1750-1921. In two volumes. London: Humphrey Milford Oxford University Press

Krishan, Y. 'Mountbatten and the Partition of India'. *History*, vol. 68, no. 222, 1983, pp. 22–38

Mitra, H. N. *The Indian Annual Register, Jul-Dec 1923.* Calcutta: The Annual Register Office

—. *Indian Quarterly Register, Jan-March 1924,* Calcutta: The Annual Register Office

Mitra, Nripendra Nath. *The Indian Annual Register, Jan.-June 1929.* Calcutta: The Annual Register Office

—. *The Indian Annual Register, Jan.-June 1937.* Calcutta: The Annual Register Office

—. *The Indian Annual Register, Jul-Dec 1939.* Calcutta: The Annual Register Office

—. *The Indian Annual Register, Jul-Dec 1942.* Calcutta: The Annual Register Office
—. *The Indian Annual Register, Jan.-June 1946.* Calcutta: The Annual Register Office
—. *The Indian Annual Register, Jan.-June 1947.* Calcutta: The Annual Register Office
Morley, John. 1920. *Speeches on Indian Affairs (Third Edition, Revised & Enlarged).* Madras: G. A. Natesan & Co
[NFL]. 1919. *Report of the Proceedings of the First Session of the All-India Conference of the Moderate Party held at Bombay in the Empire Theatre on the 1st and 2nd November 1918.* Bombay: Times Press
Nichols, Beverley. 1944. *Verdict on India.* London: Jonathan Cape
Naoroji, Dadabhai. Chunilal Lallubhai Parekh (ed.). 1887. *Essays, Speeches, Addresses and Writings (on Indian Politics) of the Hon'ble Dadabhai Naoroji.* Bombay: Caxton Printing Works
Pirzada, S. S. (ed.) (1982 Indian edition) *Foundations of Pakistan: All-India Muslim League Documents: 1906-1947.* In two volumes. New Delhi: Metropolitan Book Company
Prakash, Indra. 1938. *A Review of the History & Works of the Hindu Mahasabha and the Hindu Sanghatan Movement.* New Delhi: The Akhil Bharatiya Hindu Mahasabha
Rahman, Hafizur. *Report of the All-India Muslim Conference held at Delhi on 31st December, 1928, and 1st January, 1929.* Aligarh: Aligarh Printing Works
Rai, Lajpat. Vijaya Chandra Joshi (ed.). 1966. *Lala Lajpat Rai, Writings and Speeches.* (In two volumes). New Delhi: University Publishers
Royle, Charles. 1900. *The Egyptian Campaigns, 1882-1885.* London: Hurst and Blackett Ltd
Sarda, Har Bilas. 1946. *Life of Dayanand Sarswati World Teacher.* Ajmer [Self-published by the author]
Sen, Prabodh-chandra. 'India's National Anthem'. *The Visva-Bharati Quarterly;* vol.XV, no.1, May 1949 – July 1949; pp.30-50
Shafique, Khurram Ali. 2014. *Iqbal: His Life and Our Times.* Nottingham: Libredux
Sherwani, Latif Ahmad; ed. 1995. *Speeches, Writings and Statements of Iqbal.* Lahore: Iqbal Academy Pakistan
Singh, Gurmukh Nihal. 1950. *Landmarks in Indian Constitutional and National Development.* Delhi: Atma Ram & Sons

Short, Wilfrid M. 1918. *The Mind of Arthur James Balfour: selection from his non-political writings, speeches and addresses 1879-1917.* New York: George H. Doran Company

Tendulkar, D G. [n.d.]. *Abdul Ghaffar Khan, faith is a battle.* Bombay: Gandhi Peace Foundation

Yusufi, Khurshid Ahmad Khan (ed.). 1996. *Speeches, Statements and Messages of the Quaid-e-Azam. 4 Volumes.* Lahore: Bazm-e-Iqbal

خرّم علی شفیق

اقبال سائنسز سیریز

اقبال سائنسز (Iqbal Sciences) سے مراد یہ ہے کہ تمام سماجی علوم کو نئے سرے سے اُن اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے جو علامہ اقبال نے متعین کر دیئے تھے۔ یہ زاویۂ نگاہ معروف ماہرِ اقبالیات خرّم علی شفیق کی تحقیقات کا نتیجہ ہے، جسے وہ ۲۰۰۷ء سے اپنی تصانیف میں پیش کر رہے ہیں۔ اب الہجرہ سکولز ٹرسٹ کے تحت اِس نئے علم کے خلاصے کو ایک باقاعدہ سیریز کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جسے خرّم علی شفیق نے خود تصنیف کیا ہے۔

یہ کتابیں سب کے لیے ہیں کیونکہ ان میں جو تحقیقات پیش کی جا رہی ہیں اُن سے اہلِ علم بھی عام طور پر واقف نہیں ہیں۔ اِس لحاظ سے اِن کتابوں کی ضرورت طلبہ کو بھی ہے، اور ماہرین اور اساتذہ کو بھی!

الہجرہ سکولز ٹرسٹ کے تحت پیش کی جانے والی یہ سیریز نَو کتابوں پر مبنی ہیں۔ ہر کتاب اپنی جگہ مکمل ہے اس لیے قارئین اپنے ذوق کے لحاظ سے اِن میں سے کسی بھی کتاب سے آغاز کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہر کتاب میں دُوسری کسی نہ کسی کتاب کا حوالہ بھی شامل ہے اِس لیے آپ ان کتابوں کو جس ترتیب میں بھی پڑھیں گے، بہرحال وہ آپس میں مربوط ہوتی چلی جائیں گی۔

مصنف اور ناشر کی طرف سے اِن کتابوں کو جس ترتیب میں رکھا گیا ہے، وہ اگلے صفحے پر ہر کتاب کے موضوع کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔

اقبال سائنسز کی کتابیں

مصنف: خرّم علی شفیق

ناشر: الہجرہ سکولز ٹرسٹ

زندگی کی کتاب

انسانی علوم کا خلاصہ اقبال کی نظر سے

سرگزشتِ آدم

قدیم زمانے کی تاریخ اقبال کی نظر سے

حضرتِ انسان

انسانی علوم کا خلاصہ اقبال کی نظر سے

سیمرغ

عطار کی منطق الطیر اقبال کی نظر سے

آزادی

تحریکِ پاکستان کی مختصر تاریخ

آزادی کے بعد

پاکستان کی تاریخ ۱۹۴۷ء سے ۲۰۲۶ء تک

قومی ادب

پاکستانی ادب اقبال کی نظر سے

قائداعظم کے سیاسی اصول

علمِ سیاسیات اقبال کی نظر سے

اقبال کا فلسفہ سب کے لیے

فکرِ اقبال کے نَو بنیادی اصول

آزادی

تحریکِ پاکستان کی مختصر تاریخ

خرّم علی شفیق

تحریکِ آزادی کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا اور کہا گیا ہے، وہ زیادہ تر مصنّفین کے اپنے نقطۂ نگاہ پر مبنی ہے۔ یہ کتاب سر سیّد احمد خاں کے زمانے سے قیامِ پاکستان تک برصغیر کی مسلمان قوم کی تاریخ کو صرف اُس قوم کی نمایندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ سے بیان کرتی ہے۔ اِس طرح یہ کتاب صرف ہمارے ماضی کی ایک دلچسپ اور حیرت انگیز داستان ہی نہیں سناتی بلکہ آج کے زمانے میں ہمارے لیے رہنمائی کا سامان بھی پیش کرتی ہے۔

9786277400026

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

وقف الهجرة
AL-HIJRAH

Art: Khurram Ali Shafique using AI | Design: Syed Ahsan Ali